ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہیے اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانت حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہیے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔

(مودودیؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو بلریا گنج

جلد ۱۳ | محرم، صفر ۱۴۱۷ھ مئی جون ۱۹۹۶ء | شمارہ ۵-۶

بدل اشتراک

سالانہ زرتعاون ۵۰/۔ روپے
طلبہ کے لئے ۴۰/۔ روپے
خصوصی زرتعاون ۱۰۰/۔ روپے
اعزازی زرتعاون ۱۰۰۰/۔ روپے
غیر ممالک سے زرتعاون ۲۵ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ ۵/۔ روپے
اس شمارہ کی قیمت ۱۰/۔ روپے

مدیر مسئول
طارق فارقلیط فلاحی
مدیر
محمد اسمٰعیل فلاحی

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا جلد سالانہ زرتعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ ۲۷۶۱۲۱

پرنٹر پبلشر نور محمد فلاحی نے نشاط پریس سے چھپوا کر دفتر حیات نو بلریا گنج سے شائع کیا
فون نمبر: ۲۵۱۱۵ کوڈ: ۰۵۴۶۶ کتابت: محمد اشفاق عالم فلاحی

نقوش حیات نو

صفحہ

• **اداریہ**

یہ تھے مربی — محمد اسمٰعیل فلاحی — ٣

• **بحث ونظر**

"ہندوازم چھوڑو، اسلام اپناؤ" — سعود الرحمٰن وقار فلاحی — ٦

تحقیق کا علمی انداز واسلوب۔ — ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری — ٣٣

سوانحی ادب کا شاہکار الفاروق۔ — محمد الیاس اعظمی — ١٧

• **خطبات**

جو ہو عزم سفر پیدا۔ — سید جلال الدین عمری — ٤٢

• **گوشۂ ادب**

جناب رئیس رامپوری اور انکی شاعری۔ — محمد عنایت اللہ اسد سبحانی — ٢٨

• **طنز ومزاح**

ایٹی کیٹ۔ — امیر احمد حمیدہ — ٢٤

• **تعارف وتبصرہ**

میرا پیام اور ہے۔ — محمد اسمٰعیل فلاحی — ٥١

دروس اللغۃ العربیہ کی کتاب المعلم۔ — عبد البر اثری فلاحی — ٥٤

• **شعر ونغمہ**

تاثرات نظم — ابو البیان حماد عمری — ٦٤

نعت، غزل۔ — خوشدل، محمد ظفر اعظمی — ٥٣، ٥٥

• **جامعہ کے لیل ونہار**

جمعیت کے نئے سرپرست، جمعیت کا انتخاب، انتظامیہ کا اجلاس۔ — محمد اسمٰعیل فلاحی — ٥٦

• **روداد انجمن** — محمد اسمٰعیل فلاحی — ٤٧

• **حلقۂ یاراں** — ابو البیان حماد عمری — ٦٢

اداریہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

یہ تھے مربی

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا محمد سہول بھاگلپوری[1] رحمۃ اللہ علیہ ایک باعمل جید عالم گذرے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر، وہاں عربی مدرس اور مفتی بھی رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل تھے، پرنسپلی کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ عم محترم مولانا محمد شہباز صاحب اصلاحی نے بروایت مولانا حبیب اللہ صاحب رانچوی مرحوم بتایا۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ طلبہ برآمدہ میں سو رہے تھے۔ ایک طالب علم جو ذرا لاپروا اور کاہل قسم کا تھا، فجر بعد بھی سویا ہوا تھا، ایک بار اٹھایا، اٹھ بیٹھا، دوبارہ سو گیا، دوسری بار اٹھایا لیکن پھر بھی ایسا ہی ہوا تیسری دفعہ انہوں نے ایک ہلکی چھڑی لگائی۔ طالب علم نے کہا مجھے رات سے بخار ہے۔ یہ سننا تھا کہ مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ بالکل تڑپنے والی کیفیت کہ تم رات بھر بخار میں جلتے رہے، مجھے خبر تک نہ ہوئی، مزید یہ کہ میں نے تمہیں چھڑی لگا دی۔ طالب علم حیران کہ کیا کرے، اس نے کہا حضرت کوئی بات نہیں، کچھ نہیں ہوا، ادھر مولانا کا اصرار کہ تم بھی مجھے ایک چھڑی مارو۔ کسی نے کہا شریعت میں صرف قصاص ہی نہیں، دیت بھی ہے۔ کچھ مٹھائی منگوا لیجئے اور کھلا دیجئے۔ مولانا نے ایسا ہی کیا، پھر بات یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ بعد میں جب تک وہ وہاں رہا اور اس کے بعد بھی مولانا اس کا خاص خیال رکھتے اور اس سے معافی مانگتے تھے۔

اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ ہے، امتحان ہونے والا تھا۔ لڑکے چاہتے تھے کہ ابھی نہ ہو۔ انہوں نے اسٹرائک کر دی۔ وہ بڑی سخت قسمیں کھاتے ہوئے تھے اور عام طلبہ

[1] ایک بزرگ عالم دین، زبردست مقرر، جماعت اسلامی ہند کے رکن، ایمرجنسی میں پولیس کی لاٹھی چارج کے نتیجہ میں زخمی ہو کر اسپتال میں جان جان آفریں کے سپرد کر دیا۔

سے بھی انہوں نے قسمیں لے رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی طالب علم اس کی خلاف ورزی کرے گا تو جب جب وہ شادی کرے اس کی شادی ختم ہو جائے گی اور اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی وغیرہ۔ مسئلہ کتنا نازک اور پیچیدہ تھا۔ ایک طرف طلبہ کو انتہائی سخت قسمیں کھلائی گئی تھیں یا انہوں نے از خود کھا رکھی تھیں۔ ان کے لئے اس فیصلہ سے دست بردار ہونا آسان نہ تھا، انکی زندگی برباد ہوتی جاتی تھی۔ دوسری جانب اسٹاف کی یہ رائے کہ طلبہ کے مطالبہ کے آگے جھکنا کمزوری کی علامت اور طلبہ کے اندر بے نظمی، لاقانونیت اور سرکشی میں اضافہ کا سبب ہوگا ان کا اصرار تھا کہ امتحان وقت پر ہو اور ان طلبہ کا اخراج کر دیا جائے۔ مولانا محمد سہول بڑی آزمائش میں تھے۔ انہوں نے کسی طرح اساتذہ کو سمجھایا کہ امتحان اس وقت ملتوی کر دیا جاتا ہے پھر جلد ہی لے لیا جائے گا۔ اس سے لڑکوں کو سہولت ہو جائے گی اور قسم توڑنے کا مرحلہ نہیں آنے گا۔ امتحان کے ملتوی ہونے کی خبر طلبہ کو ہوئی لیکن کس طرح؟ مطالبہ منوا کر بھی وہ جیتے نہیں تھے۔ نقد دل ہار چکے تھے۔ مولانا ان کے سامنے تھے اور انکی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ کچھ اس طرح کے الفاظ ان کی زبان پر تھے۔ بچو! میرے بیٹو! اگر کوئی دقت تھی، کچھ پریشانی تھی، کوئی مسئلہ تھا، ہم سے کہا ہوتا، ہم لوگ آخر یہاں کس لئے ہیں، لڑکوں کی ضد جاتی رہی تھی اور اشتعال غائب تھا۔ اب وہ نادم تھے وہ بھی بہت روئے اور مولانا سے معافی مانگی۔

یہ دو چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں لیکن غیر معمولی اہمیت کے حامل تعلیم اور تعلیم سے بڑھکر تربیت بڑی حکمت، طلبہ سے غیر معمولی لگاؤ، دلسوزی اور بڑی پتہ ماری کا کام ہے۔ یہ طلبہ مہمانان رسول اور ہمارا مستقبل ہیں۔ انہیں بنانا سنوارنا ہمارا فریضہ منصبی ہے۔ ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، وہ شرارت بھی کرتے ہیں ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو پڑھنا نہیں چاہیں گے، نظم کو توڑیں گے، فرائض میں کوتاہی کریں گے یا کسی اور بری لت میں گرفتار ہوں گے، ایک استاد ان سے

آنکھیں نہیں موند سکتا، ترغیب اور تشویق سے کام لے گا اور کبھی ترہیب سے بھی سختی کا موقع بھی آسکتا ہے، خصوصاً اجتماعی نگرانی میں کبھی کبھی یہ چیز ضروری ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس کا رویہ ایک باپ کا سا ہوتا ہے۔ اس کی سختی بھی اپنائیت، پیار اور خیر خواہی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ کبھی جلاد نہیں بنتا، ان کیلئے فکر مند رہتا ہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے۔ ایک ایک بچہ سے پدرانہ تعلق رکھتا اور ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی اصلاح و تربیت میں اپنی ضد یا انا کو حائل ہونے دے۔ وہ ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی غفلت اور بے توجہی سے یا انا نا طرز عمل سے ایک طالب علم بھی اگر ضائع ہو گیا تو ملت کا بہت بڑا نقصان ہوگا اور وہ عند اللہ اپنے کو مواخذہ سے نہیں بچا سکے گا۔ اپنے زیر تعلیم یا زیر تربیت طلبہ کے معاملہ میں اس کے سامنے حضرت عمرؓ کا اسوہ رہتا ہے۔

وعثرت بغلة بالعراق	اگر عراق میں بھی کوئی خچر ٹھوکر کھا جائے
لرأيتني مسئولاً عنها بين	تو میں اپنے کو اللہ کے نزدیک جوابدہ
يدي الله تبارك وتعالى لمَ	سمجھتا ہوں کہ میں نے اسکے لئے راستہ
لمْ أسوِّ لها الطريق ـ	کیوں ہموار نہیں کیا۔

بقیہ: سوانحی ادب . .

۹ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص۵۲ معارف پریس اعظم گڑھ

۱۰ ایضاً ص۵۳

۱۱ ایضاً ص۵۲

۱۲ الفاروق ج ۲ ص۳۰۷-۳۰۸

۱۳ ایضاً ص۳۰۹-۳۱۰

"ہندوازم چھوڑو، اسلام اپناؤ"

مسعود الرحمٰن وقار فلاحی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

زیر نظر مضمون دراصل ڈاکٹر سیپن کی کتاب "NAVER BE A HINDU" کا خلاصہ ہے اس میں موصوف نے ہندوستان کے دلتوں کو ہندوازم کو چھوڑ کر اسلام کو اپنانے کی دعوت دی ہے ہندوازم کے نقائص اور اسلام کی خوبیوں سے بحث کی ہے۔ دعوتی نقطۂ نظر سے مفید کتاب ہے۔ گرچہ تمام مباحث سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم دعوت فکر ضرور دیتی ہے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کریں:

(ادارہ)

"ایک طویل مدت سے میں ان ذرائع اور طریقوں پر غور کر رہا ہوں جس کے ذریعہ مظلوم دلت طبقہ آزادی حاصل کر سکے اور اب میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ انکو آزادی حاصل کرنے کیلئے تبدیلی مذہب کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں لیکن وہ لوگ جو بابا صاحب امبیڈکر کے نظریات پر عمل کرنے کے غرور میں مبتلا ہیں، وہ صرف ریزرویشن پالیسی کی بات کرتے ہیں۔ وہ بابا صاحب کے اس قول کو بالکل بھول گئے ہیں کہ وہ اس ذات پات کو ختم کرنے کیلئے جس نے لاتعداد لوگوں کی زندگیوں کو تباہ کر رکھا ہے، تبدیلی مذہب ہی سب سے اچھا طریقہ ہے، اگر مظلوم اور غلام طبقہ معاشرے میں مساوات کا درجہ چاہتا ہے تو اسے سیاسی انقلاب سے پہلے معاشرتی انقلاب کی سخت ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ میں تبدیلی مذہب

کے عمل کو تیز سے تیز تر کرنا چاہتا ہوں۔ موجودہ حالات میں دلتوں کیلئے کونسا مذہب ہوگا؟ کیا بدھ مت، سکھ ازم، عیسائیت؟ یا اسلام؟ بلاشبہ دلت بھائیوں کو جواب میں بدھ مت صحیح لگے گا۔ مگر میں اس معاملے پر ان لوگوں سے زیادہ غور و فکر کر چکا ہوں جو لوگ جواب میں فوراً بدھ مت کا نام لیتے ہیں۔ میں نے دلت طبقہ کے بے شمار لیڈروں اور مفکروں سے اس معاملے پر گفتگو کی، گرچہ مجھے کوئی صحیح اور عملی جواب نہ ملا۔ اب میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اسلام ہی واحد راستہ ہے جس کے ذریعہ دلت بھائی ذلت آمیز اور گندے کام کرنے کی قدیم روایت سے نجات پا سکتے ہیں۔"

یہ آواز دلت طبقہ کے ایک ایسے مفکر کی ہے جو موروثی طور پر اچھوت اور غلام پیدا ہوا اور پیدائش ہی سے ظلم و استحصال اور معاشرتی ذلت و سماجی عدم مساوات کا شکار رہا۔ اس نے اپنے اور اپنے دلت بھائیوں کے ان مسائل کے حل اور ان کی فلاح و بہبود کیلئے اپنی زندگی کی پوری توانائی صرف کر دی۔ مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان میں دلتوں کے مسائل کا حل تلاش کیا لیکن انہیں دلتوں کی فلاح و بہبود کا واحد اور لازمی حل صرف اسلام میں ملا۔ وہ اپنے دلت بھائیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اسلام قبول کر کے معاشرہ میں انسانی حقوق اور سماجی مساوات حاصل کر لیں کیونکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب انہیں یہ درجہ نہیں دے سکتا۔

مذکورہ بالا اقتباس اسی دلت مفکر یعنی ڈاکٹر اے سیپن (DR. A SEPPAN) کی کتاب "نیور بی اے ہندو" (NEVER BE A HINDU) کے مقدمے کی چند سطروں کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف مذ ڈاکٹر امبیڈکر کو اپنا نظریاتی رہنما مانتے ہیں اور انہیں کے نظریات کے مطابق وہ دلتوں کو قبول اسلام کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ شروع ہی سے ڈاکٹر امبیڈکر کی قائم کردہ پارٹی "ریپبلکن پارٹی آف انڈیا" (R.P.I) کے سرگرم رکن ہیں اور فی الحال اس پارٹی کے نیشنل سکریٹری ہیں۔ وہ ایک مجلہ جدید سے (UNARUU) کے ایڈیٹر بھی ہیں جس کے ذریعہ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے نظریات کی

تبلیغ کر رہے ہیں اور دلتوں میں سماجی بیداری پیدا کر رہے ہیں وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے سچے پیروکار ہیں انہیں اس بات پر بہت افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ میں دلت طبقہ کے نام نہاد لیڈر جو ڈاکٹر امبیڈکر کے پیروکار ہونے کی شیخی بگھارتے رہتے ہیں وہی ڈاکٹر امبیڈکر کے نظریات کو توڑ مروڑ کر اور اس کی غلط وضاحت کرکے ووٹ اور اقتدار حاصل کرنے کی سیاست کر رہے ہیں، باوجود اس کے کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب کی ہدایت کی تھی اور اس کا واحد راستہ تبدیلیٔ مذہب بتلایا تھا۔ ان کے خیال میں یہ نام نہاد دلت لیڈران دراصل اپنے بھائیوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

یہ حقیقت ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دلت ہی بھارت کے اصلی اور سب سے قدیم باشندے ہیں۔ اسکے علاوہ یہ بھارت کے سب سے بڑے طبقہ آبادی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بھارت میں سب سے مظلوم یہی لوگ ہیں ابتدا ہی سے یہ لوگ اعلیٰ ذاتوں کے ہاتھوں ظلم واستحصال کے شکار رہے اور انکی غلامی کرتے رہے انہیں اچھوت، نجس اور انسانیت سے نچلے درجہ کی مخلوق تصور کیا جاتا رہا، یہ لوگ انسان ہونے کے باوجود انسانی حقوق اور آزادی سے محروم رہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں دلتوں کو کچھ حد تک آزادی مل گئی ہے لیکن ہندوستانی معاشرہ میں انہیں عزت نفس اور برابری کا درجہ اب بھی نہیں ملا۔ وہ اب بھی اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دلتوں کو اس پستی تک پہونچانے کا ذمہ دار کون ہے؟ ڈاکٹر اے سیپن جواب دیتے ہیں: "یہ ہندو مذہب ہے جو ذات پات کی پیداوار کا حقیقی مجرم ہے۔ اگر ہندو اپنے ہندو بھائیوں کو اچھوت سمجھتے ہیں تو اس میں غلطی ہندوؤں کی نہیں بلکہ اصل مجرم ہندوازم ہے۔ . . . . اور یہ ظلم واستحصال ہندوازم کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔" (نیور بی اے ہندو صفحہ نمبر ۱۰)

اور اسی سیاق میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے کہا تھا: "ہندوازم ایک خاموش

آتش فشاں پر چل رہا ہے ایک دن آئے گا جب میری عوام اپنی گہری نیند سے بیدار ہوگی، اس دن یہ خاموش آتش فشاں پھٹ پڑے گا اور ہندوازم ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جائیگا۔" (نیور بی اے ہندو ص ۳)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر سیپن کہتے ہیں کہ "ہندوازم دلتوں کا ایک مستقل دشمن ہے۔" (نیور بی اے ہندو ص ۴)

الغرض یہ کہ ہندوازم کے قوانین معاشرت اور اس کی تہذیب وادبیت ہی UNTOUCHABILITY اور ذات پات کو پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس میں ہندوؤں کا کوئی قصور نہیں۔ ڈاکٹر سیپن ہندوؤں کو بے قصور قرار دیتے ہوئے اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ "میرے تمام اساتذہ اچھے انسان تھے۔ ایک ذہین اور ہونہار طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ لوگ میری بہت قدر کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ لوگ میرے ساتھ UNTOUCHABILITY کا برتاؤ بھی کرتے تھے کیونکہ وہ سب کے سب ہندو تھے۔ اور اپنے مذہب کے بہت پابند تھے۔" (نیور بی اے ہندو ص ۲)

ہندوازم کے قوانین میں اونچ نیچ اور ذات پات کا کتنا تعصب ہے، اس کے لئے میں صرف ایک مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ منو کی دھرم شاستر میں ہے: "جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زنا کرے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں۔ لڑکی کا باپ اگر راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دیکر شادی کرلے۔ البتہ اگر لڑکی اونچی ذات کی ہو اور مرد نیچے ذات کا ہو تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہئیے اور مرد کو قطع اعضاء کی سزا دینی چاہئیے" (ادھیاء ۸، اشلوک ۳۶۵، ۳۶۶) اور یہ سزا زندہ جلا دیئے جانے پر تبدیل کی جا سکتی ہے جبکہ لڑکی برہمن ہو" (اشلوک ۳۷۷) (بحوالہ تفہیم القرآن جلد سوم صـ ۳۲۱)

ہندوازم نے دلتوں پر کیسے کیسے مظالم توڑے اور ان کا کس کس طریقے سے استحصال کیا، یہ جاننے کیلئے ڈاکٹر سیپن کی زندگی کے چند تجربات اور مشاہدات

کافی ہیں جن کا ذکر وہ اپنی کتاب 'نیور بی اے ہندو' میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیپن لکھتے ہیں کہ جب ان کے والد نے دلتوں پر توڑے جانے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانی چاہی اور حصول مساوات کیلئے انہوں نے ہندوازم کی ذلت آمیز رسومات کو ادا کرنے سے انکار کر دیا تو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے انہیں اتنا زیادہ جسمانی اور روحانی اذیت دی کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ۱۹۳۰ء میں جس سال ڈاکٹر سیپن کی پیدائش ہوئی، وہ زندگی بچانے کی غرض سے ملک چھوڑ کر سنگاپور چلے گئے۔ اس ظلم نے ڈاکٹر سیپن کے والد کو پندرہ سال کی طویل مدت تک اپنے اہل و عیال سے دور رکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سیپن کا پورا بچپن اور نوجوانی اسی ظلم و استحصال کا شکار رہی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی گندگیاں صاف کیں، انکے مردہ جانور پھینکے، انکے مردوں کو سر پہ ڈھویا اور انہیں جلایا، ان کی بلا معاوضہ خدمت بھی کی، مندروں اور مذہبی رسومات سے انہیں دور رکھا گیا، کلاس میں عام طالب علموں سے الگ بٹھائے گئے، اگر غیر دانستہ طور پر کسی کو چھو دیا تو اس کی دردناک سزائیں برداشت کیں۔ مختصراً یہ کہ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی اور ان کے دلت بھائیوں کی زندگی کسی کتے سے بہتر نہیں تھی۔

یہ کہانی صرف ایک سیپن کی نہیں۔ بھارت کے گوشوں میں نہ جانے کتنے ایسے سیپن ہونگے جو اس ظلم و بربریت کے شکار ہو رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر سیپن اپنی آپ بیتی کے علاوہ دلتوں پر توڑے گئے مظالم کے چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں جس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے ظلم کی ہر حد کو توڑ دیا ہے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں:

(۱) ضلع تنجور کے کلوینمنی (KILVENIMANI) نامی ایک مقام پر دلتوں کے ۴۴ مکانوں میں انکے مکینوں کو مقفل کر کے ان کو نذر آتش کر دیا اور ان میں سے ایک فرد بھی زندہ نہیں بچ سکا۔

(۲) ساتھ پور کے ڈھیوٹی نامی ایک مقام پر سیکڑوں دلتوں کو گولی مار کر ہلاک

کر دیا گیا اور انکی عورتوں کی عصمت دری و تذلیل کی گئی۔

(۳) ریاست آندھرا پردیش کے چندورنا می مقام پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے پولس کے تعاون سے کچھ دلتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ حقیقت بہت عام ہے کہ جب سابق نائب وزیر اعظم جگجیون رام نے ہندوؤں کے ایک بت کی پردہ کشائی کی تو اس پر اعلیٰ ذات کے ہندو اس قدر غضبناک ہوئے کہ اس بت کو گنگا کے پانی سے دھل کر اس کی وہ نجاست دور کی گئی جو اچھوت جگجیون رام کے چھونے سے پیدا ہو گئی تھی۔

انگریزی روزنامہ 'THE HINDU' اپنے ۱۳-۳-۱۹۹۲ء کے شمارے میں رپورٹ کرتا ہے کہ "ایس. بی. گوتم نے راجیہ سبھا میں کہا کہ بہار پولس میں اب بھی (UNTOUCHABLITY) برتی جا رہی ہے۔ وہاں ذات کے لحاظ سے الگ الگ پولس بارک (BARRACK) اور طعام گاہیں ہیں۔ اس حقیقت کو ریاست کے انسپکٹر جنرل آف پولس (P . G . I) نے بھی تسلیم کیا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات سے واضح ہے کہ دلتوں کا ہندو سماج میں کیا مقام ہے، اور انہیں کتنی عزت اور آزادی حاصل ہے؟ اب رہا سوال یہ کہ دلت طبقہ پوری معاشرتی آزادی و سماجی مساوات کب اور کیسے حاصل کر سکے گا۔ اس سوال کے جواب میں اپنی رائے دینے سے بہتر میں یہ سمجھتا ہوں کہ دلتوں کے قائد اعظم بھیم راؤ امبیڈکر کے فیصلے کو نقل کر دوں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے طبقے کے لوگوں کو بڑی تاکید سے کہا تھا "زردشتین کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ یہ کسی بھی دن منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہندوازم چھوڑ دو اور تبدیلی مذہب کیلئے آگے بڑھو۔ اگر ہم نے اس پر عمل نہیں کیا تو آنے والی پیڑھی ہم پر ہندوازم کا غلام ہونے کا الزام لگائے گی۔" (نیور بی اے ہندو ص ۲۵)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں: "ہندوازم کے سخت گیر قوانین کی

ظلم و زیادتی سے نجات پانے کیلئے دلتوں کا واحد راستہ تبدیلی مذہب ہے
(نیو ربی اے ہند و صفحہ ۴۹)

ڈاکٹر سٹین کہتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے ہزارہا مرتبہ تاکید کی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک آزادی و نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ ہندو رہے گا انہوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی موقع پر ہندو برقرار رہنے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن افسوسناک ہے اقتدار اور مفاد کے سبب کے ان دلت لیڈران پر جواب بھی ہندو ہیں اور اپنے طبقہ کو ہندو رہنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی تقریروں اور تحریروں میں اپنے آپ کو ڈاکٹر امبیڈکر کا سچا پیروکار کہا کرتے ہیں لیکن حقیقت ہے کہ وہ اپنے مفاد کیلئے ڈاکٹر امبیڈکر کا نام استعمال کرتے ہیں اور وہ فکری اور عملی طور پر ڈاکٹر امبیڈکر کے نظریات اور ہدایات سے کوسوں دور ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ریزرویشن اور سرکاری ملازمتوں کے ذریعہ دلت سماجی مساوات اور انسانی حقوق حاصل کر سکتے ہیں اور انہیں کسی دوسرے راستے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال ہے ۔ جیسا کہ انکے نظریوں سے ثابت ہے ۔ کہ ریزرویشن پالیسی سے دلت سماجی مساوات اور آزادی کبھی حاصل نہیں کر سکتے البتہ اسکے ذریعہ ان کی سیاسی اور معاشی ترقی کا امکان ہے ، سماجی ترقی کا واحد راستہ تبدیلیٔ مذہب ہے۔

مختصراً یہ کہ دلتوں کی آزادی، نجات اور حصول مساوات کا واحد راستہ تبدیلیٔ مذہب ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دلت ہندوازم چھوڑنے کے بعد کونسا مذہب قبول کریں۔ موجودہ حالات میں کونسا مذہب ان کے حصول آزادی و مساوات کیلئے زیادہ مناسب ہوگا۔ ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہوگا کہ ان کے لئے وہی مذہب قابل قبول ہوگا جو انہیں انسانی حقوق، مساوات اور مواخات فراہم کرے اور انہیں ظلم و استحصال سے نجات دلائے جیسا کہ ڈاکٹر امبیڈکر کہا کرتے تھے، "کسی فرد کی

ترقی کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے آزادی، مساوات اور مواخات"۔

ڈاکٹر سیپن، کئی مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے "اس استحصال کو ختم کرنے کیلئے جسے میرے بھائیوں نے برداشت کیا صرف اسلام ہی سب سے بہتر راستہ ہے۔" (نیو ربی اے ہند و صفحہ ۵۲)۔ ڈاکٹر سیپن اس لئے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ اسلام دلتوں کو قبول اسلام کے بعد جو مقام دیتا ہے وہ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب نہیں دے سکتا۔ اسلام تمام انسانوں کو آدمؑ کی اولاد قرار دیتا ہے سب کو یکساں اور برابر تصور کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر فوقیت نہیں ہے۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں فضیلت و عزت صرف تقوی کے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔" اس کی مزید وضاحت پیغمبر اسلام رحمت عالمؐ کے خطبۂ حجۃ الوداع سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا، "لوگو! خبردار ہو جاؤ تمہارا رب ایک ہے تم سب آدمؑ کی اولاد ہو کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں مگر تقوی کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے" انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی جتنی بھی شکلیں ہو سکتی ہیں اسلام نے انہیں سختی سے منع کر دیا ہے۔ سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے" "اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو"۔

اسلام کے نظریہ انسانیت، مساوات اور مواخات کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام سے قبل انسانیت کا کیا حال تھا؟ اسلام سے قبل عرب میں انسان

کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی وہاں کے غلاموں کا حال ہندوستان کے دلتوں اور شودروں سے بہتر نہیں تھا، جانوروں کی طرح غلام بازاروں میں خریدے اور فروخت کئے جاتے تھے، ان کا معاشرے میں کوئی درجہ نہیں تھا، ہر طرف حقارت و نفرت سے دیکھے جاتے تھے اور انہیں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن اسلام نے غلامی کے اس نظام کو ایسے ختم کیا کہ سرزمین عرب میں اب کوئی غلام نہیں بچا۔ قرآن میں جگہ جگہ غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی۔ محسن انسانیتؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف لیجائیں۔ نبیؐ کے غلام صحابہ حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت زیدؓ کو اسلام نے جو عزت اور مرتبہ دیا وہ انسانیت کیلئے ایک عدیم المثال نمونہ ہے حضرت بلالؓ کو اسلام کی سب سے پہلی اذان دینے کی سعادت ملی۔ حضرت زیدؓ کو پیغمبر اسلام کا منہ بولا بیٹا ہونے کا عظیم مرتبہ ملا۔ نیز حضورؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ سے ان کا نکاح کر کے عرب سماج اور دنیا کو دکھادیا کہ اسلام میں تمام انسان برابر ہیں، رنگ، نسل، قوم، خاندان اور ملک کی یہاں کوئی عصبیت نہیں، عزت و آبرو و برتری کا صرف ایک ہی معیار ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اسلام سے کسی فرد کا کوئی بھی مقام ہو یا خواہ وہ معزز ہو یا پست، وہ کسی اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا، کالا ہو یا گورا، اسلام کی چادر اوڑھنے کے بعد سب کے سب یکساں اور بھائی بھائی ہو جاتے ہیں۔ اسلام سے پہلے کی تمام اونچ نیچ اور عزت و پستی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے "الاسلام یھدم ما کان قبلہ" (اسلام، اسلام سے پہلے کی تمام چیزوں کو توڑ دیتا ہے) دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم" (مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس تم اپنے بھائیوں میں مصالحت کرتے رہو)۔ حدیث شریف میں یہی بات مختلف طریقے سے سمجھائی گئی ہے۔ نبیؐ نے فرمایا ہے کہ مسلم مسلم کا بھائی ہے۔ ایک جگہ

مومنین کی مثال ایک جسم سے دی گئی ہے کہ جب اس کے ایک حصہ کو تکلیف ہوتی ہے تو اس کی تکلیف پورا جسم محسوس کرتا ہے، ایک دوسری جگہ نبیؐ فرماتے ہیں کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم جنت میں نہیں داخل ہو سکتے جب تک کہ تم ایمان نہ لاؤ اور تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو۔"

الغرض اسلام جو نظریۂ مساوات و مواخات پیش کرتا ہے، اس کا کسی دوسرے مذہب میں تصور ہی نہیں ہے، اسلام کی انہیں خوبیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر سیتّن یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ دلتوں کی نجات کا واحد اور بہتر راستہ قبول اسلام ہی ہے۔ لیکن کچھ دلت اعتراض کرتے ہیں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے جب بدھ ازم اختیار کیا تھا تو ہمیں کوئی اسلام یا کسی دوسرے مذہب کی طرف کیوں مائل کر رہا ہے ڈاکٹر سیتن کہتے ہیں کہ یہ اعتراضات دلتوں کے انہیں مفاد پرست سیاست دانوں کی طرف سے آرہے ہیں جو ڈاکٹر امبیڈکر کے تبدیلی مذہب کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں اور وہ اب بھی ہندو ہیں اور ہندو رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ ڈاکٹر امبیڈکر کی ہدایات کے مطابق "ہر دلت کو ہندو ازم چھوڑ دینا چاہیئے اور ہندو ازم چھوڑنے کے وقت وہ اپنی پسند کا کوئی مذہب اختیار کر سکتا ہے (نیو دبی اے ہند و ص۵)

اس بات کی تصدیق ڈاکٹر امبیڈکر کے مندرجہ ذیل جملے سے ہوتی ہے جو انکی تقریر بعنوان "WHY GO FOR COVERSION" سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے کہا تھا: "تم میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں، ہندو ان کے ساتھ نہ تو چھوت کا اور نہ ہی عدم مساوات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ . . . (نیو دبی اے ہند و ص۷)

ڈاکٹر امبیڈکر نے بدھ ازم کیوں اختیار کیا؟ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ غور کرنے کی اصل چیز یہ ہے کہ کیا دلت بدھ ازم اختیار کرنے کے بعد ان مظالم و استحصال سے نجات پا سکتے ہیں، جنہیں وہ صدیوں سے برداشت کر رہے ہیں

ڈاکٹر سیپن کا خیال ہے کہ بدھ ازم اختیار کرنے کے بعد دلتوں کا پڑھا لکھا اور ترقی یافتہ طبقہ مزید ترقی کر سکتا ہے لیکن دیہاتوں میں رہنے والے کروڑوں ان پڑھ دلت صرف اسلام ہی کے ذریعہ نجات پا سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دلتوں کی ایک کثیر تعداد بدھ ازم اختیار کرنے کے بعد بھی اسی حالت میں ہے جیسا کہ پہلے تھی (ان سے) وہ اب بھی سماج کی حقیر اور ذلت آمیز رسومات ادا کرنے پر مجبور ہیں، اور انہیں پہلے کی طرح اب بھی "چمار" "پریا" وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیپن یہی سبب بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر کو بدھ ازم اختیار کرنے کے بعد چالیس سال کی مدت گذر گئی لیکن دلتوں میں بدھ ازم اختیار کرنے کے عمل میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر سیپن کہ کہتے ہیں کہ "۱۹۵۶ء کے حالات نے بابا صاحب امبیڈکر کو بدھ ازم اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔۔۔ لیکن اس سے قبل اٹھارہ ۱۹۱۸، انیس ۱۹۱۹ اور چھتیس دسمبر ۱۹۳۶ء کے حالات میں انہوں نے پانچ سو دلتوں سے سکھ ازم اختیار کروایا۔" زیڈ۔ بی اے ہند وحدت ۵ بحوالہ۔ KARE THE MOVEMENT OF UNTOUCHABITY
(BABA SAHEB AMBED جلد ۱ صفحہ ۱۵۵)

یہ واقعہ دہلی میں پیش آیا تھا۔ اس واقعہ کو لکھنے سے مراد یہ ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے حالات کے لحاظ سے کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر وہ سکھ ازم اختیار کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں تو دوسرے موقع پر بدھ ازم کی دعوت دیتے ہیں اور ایک الگ موقع پر قبول اسلام سے مطمئن اور آمادہ نظر آتے ہیں لیکن وہ ہندو برقرار رہنے کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ اسی لئے ڈاکٹر سیپن بہت ہی پر اعتماد ہو کر کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دلتوں کو کوئی ایسا مذہب اختیار کرنا چاہیئے جو ان کے لئے نجات کی راہ ہموار کر سکے۔ اور ان کی نظر میں آج کے حالات میں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب انہیں صدیوں پرانے ظلم و استحصال سے نجات نہیں دلا سکتا۔

سوانحی ادب کا شاہکار الفاروق[۱]

محمد الیاس اعظمی ایم اے

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ – ۱۹۱۴) کی تصنیفات میں سیرۃ النبیؐ کے بعد مہتم بالشان اور بلند پایہ تصنیف الفاروق ہے جو خود علامہ شبلی کو اپنی تصنیفات میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھی۔

الفاروق سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کی متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں جن میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، اور سیرۃ النعمان جیسی محققانہ و عالمانہ اور تاریخی سوانحی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں علاوہ ازیں الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، تراجم اور اسلامی کتب خانے جیسے علمی و تحقیقی اور گرانمایہ مقالات بھی طبع ہو چکے تھے اور علامہ شبلی نعمانی کے علم و تحقیق اور انشاء پردازی کی شہرت پورے ملک میں پھیل چکی تھی، علامہ کی دیگر تصنیفات کی طرح الفاروق کا شہرہ بھی بلند ہوا، علامہ شبلی نے خود الفاروق کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے اول اول اسکا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا اسکے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزاء بھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا[۲]"

[۱] یہ مقالہ ادب اسلامی کے سمینار منعقدہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے لیے لکھا گیا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی نے المامون کے بعد الفاروق لکھنی شروع کی اور اس کا کچھ حصہ لکھ بھی لیا تھا مگر اس کے لئے جن انواع و اقسام کے مراجع و مصادر کی ضرورت تھی اور علامہ شبلی جس بلند معیار و مذاق کے مطابق اس کتاب کو لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے بعض ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے

اس کے لئے بعض نادر اور علمی کتابوں کی ضرورت تھی جو یورپ میں طبع ہو رہی تھیں اس لئے انہیں الفاروق کا کام مجبوراً روک دینا پڑا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ

"ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رک گیا اور اس کے بجائے دوسرے دوسرے کام چھڑ گئے چنانچہ اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں لیکن جو نگاہیں فاروق اعظم کے کوکبہ جلال کا انتظار کر رہی تھیں، نہیں کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی سوء اتفاق یہ کہ مجھ کو الفاروق کی طرف سے بے دلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ اٹھا لیا تھا لیکن ملک کی طرف سے تقاضے کی صدائیں رہ رہ کر اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ رکھ کر اٹھا لیتا تھا"

سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے۔

"المامون کے بعد میں فاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے چند روز کیلئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں حالانکہ بات یہ تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک وہ چھپ کر نہیں آچکیں"

سنہ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم و مصر و شام کا سفر کیا جسکا ایک مقصد الفاروق کے مراجع و مواد کی فراہمی بھی تھا اس سفر میں علامہ شبلی نے متعدد نادر و کمیاب کتابوں

اور مخطوطات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کئے اور بقول مولوی محمد یحییٰ تنہا "مولانا نے اس سفر میں الفاروق کیلئے کافی مواد بہم پہونچانے کی کوشش کی اور کوئی دقیقہ تلاش و جستجو کا باقی نہ رکھا" اس کے باوجود بعض کتابیں جنکی شدت سے انہیں تلاش تھی نہ مل سکیں علامہ مسعودی کی کتاب اخبار الزمان اور کتاب الاوسط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ فن تاریخ کی جان تھیں لیکن قوم کی قوم بد مذاقی سے مدت ہوئی ناپید ہو چکیں میں نے صرف اس غرض سے کہ حضرت عمرؓ کے حالات کا پتہ لگ سکے قسطنطنیہ کے تمام کتب خانے چھان ڈالے لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی

یورپ میں جو نادر اور علمی کتابیں طبع ہو رہی تھیں ان میں سے بعض کتابیں جب چھپ کر آگئیں تو علامہ شبلی نے الفاروق دوبارہ لکھنی شروع کی لکھتے ہیں۔

"بالآخرہ ۱۰ اگست ۱۸۹۴ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے کام شروع کیا ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع اب بھی سد راہ ہوتے رہے یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی کئی مہینے کا ناغہ پیش آگیا لیکن چونکہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا اس لئے کچھ نہ کچھ ہوتا گیا یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا"

الفاروق کی ابتداء علی گڑھ میں ہوئی مگر آخری صفحہ جنت نشان کشمیر میں لکھا گیا اور دیباچہ اسی سرزمین اعظم گڑھ میں لکھا گیا جہاں آج ملک کے اہل قلم اور ارباب فکر و نظر اردو میں سوانحی ادب اور تذکرہ نویسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے اور بحث و تمحیص کیلئے جمع ہوتے ہیں۔

الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کی ابتداء ایک گراں قدر دیباچہ سے ہوئی ہے جس میں تاریخ کی ابتداء، تاریخ کی تعریف اور اسکے لوازمات، تاریخ اور داستان پردازی میں فرق، روایت و درایت، قدماء و متاخرین مورخین کے تاریخی کارنامے اور ان کی خصوصیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور فن سوانح نگاری کے عمدہ اصول و ضوابط

مرتب کئے ہیں جن کے مطابق الفاروق لکھی گئی ہے یہ دیباچہ تذکرہ نگاری و سوانح نویسی کے زریں اصولوں سے مزین ہے جس سے کوئی سوانح نگار بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

دیباچہ کے بعد فاروق اعظمؓ کا شجرہ نسب بیان کیا ہے اور انکی ولادت سے لے کر وفات تک کے حالات قلم بند کئے ہیں اسی حصہ میں انکی فتوحات کا سلسلہ وار ذکر بھی ہے، دوسرے حصہ میں فاروق اعظمؓ کے مالی، ملکی اور فوجی انتظامات اور انکے ذاتی اخلاق و عادات، علمی کمالات اور مجتہدانہ کارناموں کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔

مولانا سعید انصاری صاحب نے لکھا ہے کہ الفاروق مولانا (شبلی) کے سوز خامہ اجتہاد اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے انہوں نے مصر و شام اور ترکی جیسے دور دست ممالک کی خاک چھانی۔ مشہور مورخ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس کو جو بھی پڑھے گا وہ حضرت عمر فاروقؓ کو ایک بہترین فاتح ایک بہترین فرماں روا ایک بہترین مسلمان اور ایک بہترین انسان تسلیم کر کے محظوظ ہوگا مسلمان تو اس کتاب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ سکندر، ذوالقرنین، نوشیرواں، امام ابو حنیفہ، حضرت عبدالقادر جیلانی، خواجہ بہاؤالدین، جلال الدین رومی اور شیخ فریدالدین عطار میں جتنی خوبیاں علیحدہ علیحدہ تھیں وہ سب حضرت عمرؓ میں جمع ہو گئی تھیں۔"

اردو میں الفاروق سے پہلے کئی سوانح عمریاں لکھی جا چکی تھیں خاص حضرت عمرؓ کے حالات اور کارناموں پر بھی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر الفاروق کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہو سکی جسکے مختلف اسباب میں ایک نمایاں اور اہم سبب کتاب کے ادبی اسلوب کے ساتھ مثالی علمی نثر کا حسین امتزاج ہے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اس لئے بھی بہترین قرار دیئے جانے کے لائق ہے کہ اس کے اسلوب میں ہشت پہل ہیرے کی جو چمک

دمک ہے یا اس کے انداز بیان میں در شاہوار کی جو آبداری ہے وہ کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔[1]

الفاروق کو تاریخ و ادب کا سنگم کہا جا سکتا ہے اس میں رزم ہو یا بزم فتح ہو یا شکست، خانہ جنگی و بغاوت کا تذکرہ ہو یا آراضی کا بندوبست، خراج کی وصولی کا انتظام ہو یا زمین کی پیمائش، مال غنیمت کی تقسیم ہو یا ذمیوں کے حقوق یا مسلمانوں کے باہمی معاملات تمام تفصیلات کی مرقع آرائی علامہ شبلی کے سحر نگار قلم نے اس طرح کی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور تاریخ کے اصولوں سے کہیں انحراف بھی نہیں ہوتا،

الفاروق کی زبان میں جو شستگی و برجستگی، دلکشی و رعنائی، عبارت کی بے ساختگی و ہمواری، ایجاز و اختصار، طنز و تعریض، قوت و شعریت اور جوش بیان ہے وہ علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کا طرہ امتیاز اور علمی و ادبی نثر کا حصہ ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

"الفاظ کی رنگینی، عبارت آرائی کے تصنع، انشاپردازی کے تکلف، جملوں کی سجاوٹ اور آورد سے پاک اور منزہ ہو کر اس کتاب کے تمام پیراگراف سادگی و پرکاری کے جواہر پارے بن گئے ہیں[2] مثلاً

مثلاً حضرت عمرؓ کی جامعیت اور گوناگوں خصائل انسانی سے معمور ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قانون فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے ممکن بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا لیکن اور فضائل سے اس کو بہت کم حصہ ملا تھا سکندر سب سے بڑا فاتح تھا لیکن حکیم نہ تھا ارسطو حکیم تھا لیکن کشورستان نہ تھا بڑے بڑے کمالات ایک طرف چھوٹی چھوٹی فضیلتیں بھی ایک شخص میں مشکل سے

جمع ہوتی ہیں بہت سے نامور گزرے ہیں جو بہادر ہیں لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے، بہت سے پاکیزہ اخلاق تھے لیکن صاحب تدبیر نہ تھے بہت سے دونوں کے جامع تھے لیکن علم و فضل سے بے بہرہ تھے۔

اب حضرت عمرؓ کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی، تیمور بھی تھے اور نوشیرواں بھی امام ابو حنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادھم بھی۔

سب سے پہلے حکمرانی اور کشورستانی کو لو دنیا میں جس قدر حکمراں ہوئے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتاً فتوحات تھک رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔

سکندر ہر موقع پر ارسطو کی ہدایتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا اکبر کے پردے میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے عباسیوں کی عظمت و شان برامکہ کے دم سے تھی لیکن حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا۔[6]

حضرت عمرؓ کی سادگی اور جلالت شان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے ہاں پانی بھر آتا ہو فرش خاک پر پڑ رہتا ہو، بازاروں میں پھرتا ہو جہاں جاتا ہو جریدہ و تنہا چلا جاتا ہو اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، در و دربار نقیب و چاؤش حشم و خدم کے نام سے آشنا نہ ہو اور پھر یہ رعب ہو کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لیکر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا عمر فاروق کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا

لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے"[7]

ارباب فکر و نظر جانتے ہیں کہ ادبی موضوعات پر تحریریں خود بخود دلآویز دلکش اور رنگین ہو جاتی ہیں اور خشک موضوعات میں بے کیف مگر کمال انشاپردازی یہ ہے کہ خشک اور بے کیف موضوعات میں بھی ادب و انشا کا طلسم نہ ٹوٹے علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ انہوں نے خشک اور بے کیف موضوعات میں بھی اپنی انشاپردازی سے ایسی شان پیدا کر دی ہے کہ ان کی تحریریں دلآویز و دلنشیں موثر اور اثر انگیز ہو گئی ہیں۔ الفاروق کوئی ادیب لکھتا تو صرف ادب و انشا کی رنگینی و رعنائی ہوتی کوئی شاعر لکھتا تو شاہنامہ ہو جاتی، کوئی مورخ لکھتا تو محض تعلقات کا مجموعہ ہوتی، اور کوئی فلسفی لکھتا تو فلسفہ کے بے کیف مباحث ہوتے لیکن اس کا مصنف جامع العلوم تھا۔ وہ ادیب بھی تھا، شاعر بھی تھا، مورخ بھی تھا انشاپرداز بھی تھا، محقق بھی تھا، ناقد بھی تھا متکلم بھی تھا فلسفی بھی اور ماہر تعلیم بھی تھا مصنف کی اسی جامعیت اور گوناگوں سے الفاروق تاریخ و ادب کا شاہکار ہو گئی ہے۔

حوالے

۱؎ علامہ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵ مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ۔ علامہ شبلی نعمانی کا یہ قول سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے کا ہے۔

۲؎ علامہ شبلی نعمانی، الفاروق دیباچہ ص ۱ معارف پریس اعظم گڑھ

۳؎ ایضاً

۴؎ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النعمان دیباچہ ص ۲ - مکتبہ اعزازیہ دیوبند

۵؎ مولانا محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین ج ۲ ص ۱۴۲

۶؎ الفاروق ج ۱ ص ۱۷

۷؎ الفاروق دیباچہ ص ۱-۲

۸؎ مولانا سعید انصاری، مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز ص ۶۷ الناظر بک ڈپو لکھنؤ

بقیہ صفحہ پر

طنز و مزاح

ایٹی کیٹ[1]

امیر احمد چیدہ۔ باسن

دورِ حاضر میں آپ نے لفظ الرجی (ALLERGY) سنا ہوگا۔ جہاں کہیں زکام ہوا۔ تو کہا گیا کہ الرجی ہو گئی ہے۔ اگر کوئی تشخیص شدہ گولی کھائی اور سارے جسم پر آبلے نکل آئے تو بھی یہی کہا گیا ڈاکٹر نے کہدیا ہے الرجی ہو گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح مغربی تہذیب کے پروردہ لوگوں کی باتیں ان کے طور طریقے ان کے رہن سہن اور ان کے طرزِ طعام دیکھ کر ہمیں گویا ایک قسم کی دہشت سی ہونے لگتی ہے۔ ہم یہی سوچتے ہیں کہ ہمیں بھی شاید الرجی ہو گئی ہوگی۔ وحشت سے مراد خدارا آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہمیں کوئی دل کا عارضہ ہو گیا ہے۔ عارضہ اگر خدانخواستہ ہوگا بھی تو اس سے ہولِ دل ہوگا۔ گھبراہٹ ہوگی پریشانی ہوگی۔ اور خدا کا شکر ہے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خیر سے اپنا اچھا خاصا دل ہے جو دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں اس مغربی طرزِ زندگی کے اپنانے والوں کو دیکھکر ہم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جسے دیکھکر یہ مغرب زدہ لوگ خود ہمیں "دہشت" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ اور واقعہ ہے کہ ہم اسی نام سے موسوم بھی ہو گئے آپ ہی بتائیں کہ ہماری یہ دہشت کس حد تک حق بجانب ہے۔ کیا ہم بالکل یا دہشت کہلانے کے مستحق ہیں؟۔ آیئے ذرا اسکا تجزیہ کریں۔ ہمیں مغربی تہذیب والوں کو برا بھلا کہنے کا چنداں حق نہیں۔ وہ انکی اپنی تہذیب ہے۔ انکا اپنا کلچر ہے انکی اپنی۔ ہاں ہے رونا تو اس بات کا ہے کہ مغربی تہذیب کو اپنانے کی بے انتہا کوشش اور اس کے حصول کو معراج سمجھ بیٹھے ہیں۔ انگریزی الفاظ کے بعض الفاظ معنوی لحاظ سے اپنے خدوخال میں بڑے ہی نرالے اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ انکا اگر ترجمہ کیا جائے تو انکی

۱؎ ETIQUETTE

شکل ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً آپ اسی (ETIQUETTE) ایٹی کیٹ ہی کو لے لیجیے۔ اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو "عوائدِ رسمیہ" ہوگا۔ یعنی سماج کے عاید کردہ رسم و رواج کا اعادہ کرنا۔ اب جیسے ہم میں سے کسی کی ہتک ہو گئی تو اپنی ہتک سمجھتے ہوئے "انسلٹ" کا مہذب لفظ استعمال کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ پھر اس بات کا اندیشہ بھی رہ جاتا ہے کہ اگر ہم نے انسلٹ کا مہذب لفظ استعمال نہ کیا تو کہیں ہم سماج کی نظروں میں گر نہ جائیں۔ ویسے ہمیں انگریزی کی شُد بُد نہ ہو نہ سہی لیکن بول چال کے انداز میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ گویا ہم بڑے انگریزی داں ہیں۔ اب آیئے ہم آپ کے سامنے اس نقالی کی نقاب کشائی کریں گے۔ آپ جس گھر میں بھی جائیں گے۔ اس گھر کے ان نونہالوں کو جو ابھی ابھی بولنا سیکھ رہے ہوں۔ انہیں سب سے پہلے اپنے پیارے امی وابا کو ڈیڈی (Daddy) اور ممی (Mommy) سے خطاب کرتے ہوئے پائیں گے۔ انہیں امی و ابو کے نام سے پکارنا بالکل دقیانوسی سا لگتا ہے۔ اس میں وہ اپنی انسلٹ سمجھتے ہیں۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے اپنی کوئی خالہ یا پھوپھی کو خالہ یا پھوپھی کہنے میں اپنی انسلٹ سمجھتے ہیں۔ گویا آنٹی یا انکل نہ کہیں تو سوسائٹی انہیں رد کر دے۔

ویسے ہمیں اپنی کون سی چیز پسند ہے۔ نہ اپنی زبان میں بات چیت کرنا اپنے لئے اچھا سمجھتے ہیں نہ ہی اپنی تہذیب و تمدن جس پر ہمیں صدیوں سے ناز تھا۔ آج ہمارے لباس کو اوروں نے اپنا لیا۔ مثال کے طور پر جبہ و شلوار اور پھر شیروانی ہمارے کلچر کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے اب وہ اوروں کا لباس بن گئی ہے گویا وہ صدیوں سے انکی قومی پوشاک رہ چکی ہو۔ شیروانی کا مذاق تو خود ہم لوگوں نے "اوپر شیروانی اندر پریشانی" کہہ کر اڑایا ہے۔ یہی شیروانی آثارِ قدیمہ کی طرح نکاح کی محفلوں میں مسندِ نوشہی پر دولہا کا لباس بنتی رہی۔ اب وہ بھی دقیانوسی بن گئی۔ اب یہی شیروانی منسٹروں کا لباسِ فاخرہ بن گئی ہے۔ غرضیکہ ہماری کل کل میں بناوٹ آ گئی ہے۔ ہم "مسٹر" کے لقب سے بہت خوش

"جناب" یا "مولانا" کہنے پر منھ بن جاتا ہے۔ مسز فلاں کہنے پر آپ خوش ہو جاتی ہیں بیگم فلاں یا اہلیہ فلاں کہہ دیں تو پیشانی پر ہزار بل پڑ جائیں گے۔ کسی کے ہاں لنچ یا ڈنر پر جانا کہتے ہوئے فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے یا کسی ظہرانے پر بلایا گیا ہے تو شرم آجاتی ہے اسلام علیکم کہنے پر ہتکی سی محسوس کریں گے "ہیلو" یا "ہاؤ ڈو یو ڈو" پر تو گویا جان قربان ہوتی جاتی ہے۔ کسی سے مل کر جدا ہوتے وقت بچوں کی زبانی خدا حافظ کہلوانا یا کہنا گویا "آؤٹ ڈیٹیڈ" سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ٹاٹا۔ بائی بائی کہنے پر شان اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی سن کر ناک بھنویں چڑھ جاتی ہیں وہی بوگیم اور ڈسکو پر خود بخود سر اور کمر حرکت میں آجاتی ہے جیسے آپ کی گردن اور کمر بس بوگیم اور ڈسکو ہی کیلئے بنی ہے چینی اور جاپانیوں کو اپنا قومی لباس پہننے میں عار نہیں۔ وہ دوسروں کا لباس پہننا معیوب سمجھتے ہیں۔ اب تو ہمارا کوئی قومی لباس ہی نہ رہا۔ اب تو ہم چوں چوں کا مربہ بن گئے ہیں۔ کل تک ساڑی پہنی جاتی تھی۔ لڑکیاں پاجامہ کرتہ یا جبہ و شلوار پہنا کرتی تھی۔ اب کبھی کفتان ہے تو کبھی ٹائٹس۔ پھر کبھی بگی ہے تو کبھی میڈی اور جینس۔ خدا معلوم اب اور کیا کیا خرافات پہنے جائیں گے۔

اب آئیے ہم آپکو اٹی کیٹی کی ایک اور جھلک دکھائیں گے۔ گھر آئے ہوئے مہمان کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہوٹل میں انکے اعزاز میں ڈنر دیں گے شاید ان کے نزدیک گھر پر مہمان نوازی کرنا خلاف اٹی کیٹی ہے۔ اب تک ڈنر لنچ اور ٹی پارٹیاں ہوٹلوں میں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو نکاح مسنونہ کے ساتھ شب زفاف اگر ہوٹل میں نہ گذری تو بالکل خلاف اٹی کیٹی ہے اور شادی کا مزہ کر کرا ہو جائیگا۔ اب سے برسوں آگے علامہ اکبرالہ آبادی نے کیا خوب پیشین گوئی کے طور پر یہ شعر لکھ دیا تھا سو وہ آج کس قدر صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ خود فیصلہ کیجئے۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی منھ نہ گھر کا دیکھا   کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

اپنا کوئی عزیز غریب ہے تو محفل میں اس سے باتیں کرتے ہوئے

آپ کو شرم اور جھجک سی ہوگی کہ کہیں آپ کے مہذب دوست واحباب آپکو بھی اس جیسا نہ سمجھ لیں کہ ایک معمولی لباس پہنے ہوئے عورت یا مرد سے آپ کا تعلق ہے آپ کے جگمگاتے لباس سے پھوٹتی ہوئی سینٹ کی بو اس کی قربت سے ضرور متاثر ہوگی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایسے وقت میں آپ کترا کر نکل جائیں گویا آپ نے انہیں دیکھا ہی نہیں یا جانتے ہی نہ ہوں۔

اس اٹی کیٹ کے پیچھے خواہ ہم میں کتنے ہی عیوب کیوں نہ ہوں ہماری زندگی کتنی ہی گھناؤنی کیوں نہ ہو ہم دوسروں کی عیب جوئی ضرور کریں گے۔ یہ ہے ہماری بود و باش اور ہمارا رہن سہن کوئی ستر سال پیشتر علامہ اقبال نے نوجوانوں کی اس مغرب پرستی کو دیکھ کر کیا خوب کہا تھا ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی   لہو مجھکو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل   نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اب آپ ہی سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ کون ہے "یادحشت؟" ہم یا وہ؟

بقیہ ۔۔ رئیس رامپوری ۔۔۔

کی شاید زیادہ صحیح ادائیگی ہو سکے ؎

اب جو میرے ساتھ ہے اپنی خوشی سے ساتھ ہے

اس لئے کہ غالباً شاعر یہی کہنا چاہتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے میرے ساتھ ہے کلام رئیس میں اس طرح کی خامیاں کہیں کہیں نظر آئیں۔ اور یہ خامیاں ایسی ہیں جن سے کسی شاعر کا کلام پاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کلام رئیس میں اس طرح کی کچھ خامیاں ہیں تو ان سے کلام رئیس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

جناب رئیس رامپوری کی شاعرانہ عظمت کا میں دل سے معترف ہوں۔ اور میری یہ چند معروضات اگر انہیں ناگوار خاطر ہوں تو اس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

جناب رئیس رامپوری اور انکی شاعری

محمد عنایت اللہ اسعد سبحانی

جناب رئیس رامپوری کا دوسرا مجموعۂ کلام "تاثرات" میرے سامنے ہے، رئیس رامپوری سے میری کوئی سابقہ شناسائی نہ تھی۔ ابھی حال ہی میں ان کے ساتھ پہلی بار ایک مختصر سی ملاقات رہی، ورنہ اس سے پہلے نہ ان سے کبھی ملاقات ہوئی تھی نہ ان کے کلام سے۔ اس وجہ سے جب "تاثرات" میرے ہاتھوں میں آئی تو میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے مطالعہ کی میز پہ ڈال دیا کہ کبھی فرصت ہوگی اور طبیعت میں آمادگی ہوگی تو دیکھ لی جائے گی۔

پھر ایک روز جب مجھے اپنے کاموں سے کچھ فرصت ملی، میں اس کتاب کو کچھ بے اعتنائی کے ساتھ الٹنے پلٹنے لگا۔ اس دوران متعدد اشعار میرے سامنے آئے جنہیں چھوڑ کر میں آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ وہاں ٹھہر کر انہیں کچھ دیر گنگناتا رہا۔ مثلاً

رسوا کیا ہے خوب ہمیں تم نے دوستو — اور ہم نے سارے عیب تمہارے چھپا لئے

ان کے کسی تقاضے کو پورا نہ کر سکا — میں زندگی سے خود ہی بہت شرمسار ہوں

ہر حسین راہ میں ہی ہوا حادثہ، کہہ رہا ہے یہ ہر گام کا تجربہ
خیر چاہو تو کانٹوں پہ چلتے رہو اور پھولوں سے دامن بچاتے رہو

عجب سرور و کیف میں رہِ حیات کٹ گئی — ہم اپنے دل میں ایک ہی آرزو لئے پھرے
سکوں میں تھک کے بیٹھنا ہے کسرِ شانِ زندگی — جنوں کی خیر مانگئے جو کو بہ کو لئے پھرے

وہ تو آنسو نکل پڑے ورنہ — میں کہاں شرحِ واقعات کہاں

جامِ مے چھین لیا کرتے ہیں ہم اے ساقی — پست ہمت گلۂ تشنہ لبی کرتے ہیں

یہ اور اسی قسم کے درجنوں اشعار میرے سامنے آئے، جن سے کلامِ رئیس کی عظمت میرے دل میں بیٹھتی چلی گئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کلام ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔

اس کے بعد تو بارہا ایسا ہوا کہ "تاثرات" کو میں نے اٹھایا کوئی ایک شعر دیکھنے کے لئے، مگر اس ایک شعر پر ہی میں ٹھہر نہ سکا، بلکہ آگے پیچھے کے کتنے ہی اشعار دامنِ دل کھینچنے لگے۔ اور پھر قدرے بے خودی کے عالم میں دیر تک میں ان اشعار کو گنگناتا اور ان سے دل بہلاتا رہا۔

کسی شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے پڑھنے لگے تو چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔ رئیس صاحب کے اشعار میں بہت حد تک یہ خوبی موجود ہے۔

رئیس رامپوری کے کلام میں فی الجملہ وہ تمام محاسن موجود ہیں جو کسی اچھے اور معیاری کلام کیلئے ناگزیر ہوا کرتے ہیں۔

ان کے کلام میں بڑی روانی اور برجستگی ہے۔ دلکشی اور خوبصورتی ہے۔ سادگی اور اثر آفرینی ہے۔ بے باکی اور حقیقت بیانی ہے۔ دردمندی اور دلسوزی ہے۔

یہ تمام اوصاف ان اشعار میں موجود ہیں جو ابھی پیش کئے گئے۔ مزید کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جو ان خصوصیات کی بہترین مثال ہیں۔

زمانہ جنہیں ناخدا کہہ رہا ہے — جو کتنے سفینے ڈبوئے ہوئے ہیں
کبھی ان پہ چلنا پڑے گا تمہیں بھی — جو کانٹے تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں

پہلے شعر میں کتنا بھرپور طنز ہے سربراہانِ قوم اور قائدینِ ملت پر! مگر کتنی ستھرائی اور خوبصورتی کے ساتھ۔

پھر دوسرے شعر میں انہی ناخداؤں کے لئے کتنا زبردست انتباہ ہے! مگر انتہائی بے تکلفی اور چابک دستی کے ساتھ۔

جیسے جیسے ہم زمانہ آشنا ہوتے گئے — اپنے طالب آپ اپنا مدعا ہوتے گئے

کتنی حکمت کی بات ہے، اور کس قدر خوبصورتی اور سادگی کے ساتھ جناب رئیس نے ادا کی ہے۔ زمانہ اور اہلِ زمانہ پر تکیہ وہی لوگ کرتے ہیں جو زمانہ آشنا نہیں ہوتے مگر زمانے کو جو اچھی طرح پہچان لیتے ہیں، وہ کبھی اس سے دھوکا نہیں کھاتے۔ وہ ہمیشہ اپنے دست و بازو پر اعتماد کرتے اور اپنی پوشیدہ طاقتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ نکھرا ہوا رنگ یونہی نہیں ہے ہم اشکوں سے چہرے کو دھوئے ہوئے ہیں

خدا پرستی اور حبِ الٰہی کے نتیجے میں ایک مومن کے چہرے پہ کیسی رونق ہوتی ہے ایک بندۂ خدا مست جب خدا کی یاد میں روتا اور آنسوؤں کے قلزم بہاتا ہے تو اس کے چہرے پر کیسی تابانی آ جاتی ہے، جناب رئیس نے اس کیفیت کو کتنی خوبصورتی اور بے تکلفی کے ساتھ شعری پیرایہ میں ڈھال دیا ہے۔

ہم کو بجھانے اٹھتی ہیں سفاک آندھیاں ہم جگمگاتے رہتے ہیں یہ اور بات ہے

ایک باعزم قافلۂ حق کی جو کیفیت ہوتی ہے باطل طاقتوں کے نرغے میں، اس کو کتنے دل پذیر انداز میں ادا کیا ہے۔ ایک طرف بے رحم اور سفاک آندھیاں ہیں جو شمعِ حق کو بجھا دینے پر تلی ہوتی ہیں اور دوسری طرف اس شمعِ حق کی سخت جانی کا یہ عالم ہے کہ ان آندھیوں سے بجھ جانا تو در کنار، اس کی لو اور تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

سفاک آندھیوں کے مقابلے میں جگمگانے کا منظر کتنا دلکش اور کس قدر متقابل ہوا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں حق کی سرخروئی اور باطل کی ناکامی کی کیسی بھرپور تصویر ہے یہ۔

یوں تو رئیس صاحب اصلاً غزل کے دلدادہ اور بحرِ غزل کے شناور ہیں، لیکن دوسرے اصنافِ سخن میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے "بچے" کے عنوان سے ایک رباعی کہی ہے، جس کے یہ اشعار کتنے خوبصورت ہیں ؎

دل کے اجالے پیار کے نغمے، آنکھوں کے تارے بچے ہیں بھولی بھالی صورت والے، پیارے پیارے بچے ہیں

دھوم مچاتی ہنستی شمعیں، بولتے باتیں کرتے پھول قدرت کے شہکار ہمارے اور تمہارے بچے ہیں

اسی طرح رئیس صاحب کا یہ قطعہ کتنا پیارا اور دلربا ہے ؎

انساں کی عظمت ہی تھی جس سے اب تک قدروں کا ہالہ تھا یا سوچ رہے ہیں ہم ہی غلط یا دنیا کو احساس نہیں
منظر تو حسیں ہو سکتا ہے، ماحول حسیں کیسے ہوگا جو چھائے ہوئے ہیں محفل پر خوش پوش ہیں خوش انفاس نہیں

رئیس صاحب نے مرثیہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اور اس میں بھی وہ کامیاب رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے چھوٹے بھائی ریاست نور خاں ایڈوکیٹ کا مرثیہ کہتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کس سے یہ سلسلۂ سوزِ دروں ملتا ہے اب تو رونے سے ہی کچھ دل کو سکوں ملتا ہے
جانے کس کس نے یونہی کھوئے ہیں دل کے ٹکڑے جانے کس کس سے مرا حالِ زبوں ملتا ہے
چھپ گیا جب سے مرا نور مری آنکھوں سے مجھ کو ہر سمت اندھیرے کا فسوں ملتا ہے
وائے تقدیر کہ میں جب بھی اٹھاتا ہوں نظر وقت کے چہرے پہ احساس کا خوں ملتا ہے
یوں تو دیوانہ بنا پھرتا ہے ہر ایک رئیس کون شائستۂ آدابِ جنوں ملتا ہے

اس مرثیہ میں اپنے احساساتِ غم کو ہمارے شاعر نے کس قدر سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ایک کامیاب مرثیہ کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس میں نہایت سادہ اور فطری انداز میں اپنے درد و غم کی جاں کاہیوں کو سمو دیا جائے، اور یہ شان اس مرثیہ میں بہت حد تک موجود ہے۔

یہ چند شعری نمونے ہیں جو مشتے از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں، ورنہ کلامِ رئیس میں عمدہ اشعار کی کمی نہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوصف "تاثرات" میں کچھ جگہیں ایسی بھی ملیں جو ذوق پر گراں گزریں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ہے، جس کا عنوان ہے: "یہ میرا وطن ہے"۔ اس میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں ؎

اس خلد کو گاندھی نے جواہر نے نکھارا
اس [illegible] آزاد نے جوہر نے سنوارا

شاداب یہاں صبح تمنا کی کرن ہے ص۱۳۶

صبح تمنا کی کرن کے لئے "شاداب ہونے" کا محاورہ قابل غور ہے۔

اسی طرح بھارت کے لئے "خلد" کا لفظ استعمال کرنا، پھر اس کے نکھار کو گاندھی اور جواہر کی طرف منسوب کرنا ایک باشعور اور دردمند مسلم شاعر کے لئے کوئی اچھی بات نہیں۔ ویسے پوری نظم اپنے اسلوب و آہنگ کے لحاظ سے بہت اچھی ہے

اسی طرح ایک جگہ جناب رنمیں فرماتے ہیں ؎

کیسی کیسی ہستیاں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں   کیسے کیسے لوگ دنیا سے خفا ہوتے گئے

یہاں "خفا ہوتے گئے" کا محاورہ خلاف واقعہ ہے، اس لئے کہ جو ہستیاں اس دنیا سے رخصت ہوتی ہیں وہ خفگی کے نتیجہ میں نہیں جاتیں۔ اگر وہ اس دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور نہ ہوتیں تو کبھی اس دنیا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتیں۔

یہاں تو صورت حال کچھ اس قسم کی ہے کہ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی گئے

اس سے انکار نہیں کہ جناب رنمیں سے پہلے کے بھی بعض اہم شعراء نے یہ مضمون باندھا ہے، لیکن اس سے اس کے خلاف واقعہ ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور شعر کی بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اندر واقعیت پائی جائے اس کی کوئی بات خلاف واقعہ نہ ہو۔

میرے خیال میں تھوڑا سا تصرف کرکے اگر شعر یوں کر دیا جائے ؎

کیسے کیسے لوگ دنیا سے جدا ہوتے گئے

تو شعر کا یہ عیب دور ہو جائے گا۔ اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جائیگا

اسی طرح جناب رنمیں کا ایک شعر ہے ؎

ہو چکی ہیں مشکلات راہ سب پر آشکار   اب جو میرے ساتھ ہے اپنی خوشی کے ساتھ ہے ص۲۵

دوسرے مصرع میں "کے" کے بجائے "اگر" سے "کر دیا جائے تو شاعر کے مفہوم

بقیہ صفحہ ۳۷ پر

تیسری قسط

تحقیق کا علمی انداز و اسلوب

تحریر ____________ ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری

ترجمانی ____________ انیس احمد فلاحی مدنی

چھٹا مرحلہ

علمی مواد کا تجزیہ اور کتابت

معاون علوم اور اسکے اثرات

علمی مواد کے عمدہ اور بہتر تجزیہ کا دارومدار

ریسرچ اسکالر کی ذہنی فکری و علمی صلاحیت، نیز ان علوم و فنون سے واقفیت پر ہے جو اس کے موضوع کی تشریح و توضیح میں معاون و مددگار ہو سکتے ہوں۔

مثال کے طور پر ایک مورخ کو درج ذیل علوم کی ضرورت پڑتی ہے۔

۱۔ علم الخطوط۔ تاکہ وہ ان مختلف مخطوطات کو پڑھنے پر قادر ہو سکے جو مختلف اقسام و انواع کی تحریروں جیسے مشرقی مغربی، خط نسخ اور خط تعلیق میں لکھے ہوتے ہوتے ہیں۔

۲۔ علم جغرافیہ: چونکہ تاریخی احداث و واقعات اسی زمین پر واقع ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ریسرچ اسکالر کا علم جغرافیہ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ زمین کی قدرتی بناوٹ اور اسکے نشیب و فراز کبھی کبھی شکست و فتح میں اہم رول ادا کرتے ہیں

۳۔ علم نفس: تاکہ ریسرچ اسکالر انسانی افعال کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کر سکے

۴۔ عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات سے واقفیت: کیونکہ یہ علوم بھی انسانی معاشرہ پر اپنے حدود میں مختلف انداز سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ بات مسلم ہے کہ نصوص و روایات کی توضیح و تشریح میں نقد کے جدید

اسالیب جیسے تاریخی اسلوب اور تنقیدی اسلوب بھی ریسرچ اسکالر کے افکار و خیالات میں گہرائی پیدا کریں گے جس سے مقالہ کی اہمیت دوچند ہو جائے گی۔ لیکن یہ امر دین میں گہری بصیرت کا متقاضی ہے تاکہ یہ چیز اسے اسلام مخالف مادی افکار و نظریات کے تسلط میں جانے سے بچائے کیونکہ مقصود اس عقلی تفکیر کے فوائد و ثمرات سے استفادہ ہے جو نقد کے جدید اسالیب کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں نہ کہ ان کے سامنے خود سپردگی اور ان کا اتباع کامل۔ کیونکہ استفادہ کے بجائے اگر اتباع کی صورت پائی گئی تو یہ چیز اسلامی خصائص و امتیازات کو ختم کر دینے کے مترادف ہوگی

مورخ کے لئے ایسے ہی خالص دینی علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان اصول و مبادی اور ان اصول تعلیم و تربیت سے آگاہ ہو سکے جو اسلامی معاشرہ کو منظم اور اسکی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے اندر اٹھنے والی مختلف تاریخی تحریکوں اور بغاوتوں میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

علم تفسیر کے معاون و مددگار علوم درج ذیل ہیں۔

۱۔ علم لغت کیونکہ آیات کے سمجھنے کا دار و مدار الفاظ قرآن کے سمجھنے پر موقوف ہے اور اگر کسی لفظ کی صحیح تحقیق نہ ہو سکے تو آیت کے صحیح مفہوم کو پانا مشکل ہو جاتا ہے اور نتیجۃً آیت کے مدعا و مقصود اور اسکی حکمت کی جانب ذہن نہیں جا پاتا ہے۔

۲۔ علم نحو و صرف، ۳۔ علم المعانی والبیان والبدیع: تاکہ وہ قرآن کے ادبی محاسن اور صوتی حسن و جمال سے واقف ہو سکے جسکے بعد ہی قرآن کے باطنی حسن و جمال کا ادراک ممکن ہے۔ ۴۔ علم قرأت، ۵۔ ناسخ اور منسوخ آیات سے واقفیت، اسباب النزول اور تاریخی پس منظر، نیز اصول فقہ اور علم کلام سے واقفیت۔

اسی طرح احادیث نبویہ کی تحقیق و دراسۃ کے لئے لغت، فقہ، تفسیر اور اصول فقہ سے واقفیت ضروری ہے تاکہ احکامی احادیث کی توضیح و تشریح کرنے

میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

الغرض علمی مواد کے عمدہ اور بہتر تجزیہ کا دار و مدار طالب علم کی اپنی ثقافت اور مختلف علوم و فنون سے اسکی واقفیت پر منحصر ہے۔

ب: اقتباس اور ذاتی تحقیق کا باہمی امتیاز۔

تحقیق کا ایک ناگزیر اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ذاتی۔ افکار و نتائج اور دیگر کتابوں سے ماخوذ اقتباسات و نصوص کے درمیان فرق قائم کیا جائے نیز ان کے مصادر کی نشاندہی بھی لازماً کر دی جائے کسی پیراگراف کے حرف بحرف نقل کرنے کی صورت میں ضروری ہے کہ علامت اقتباس "   " بھی وہاں لگائی جائے۔ اور اقتباس نہ لیا گیا ہو بلکہ فکری یا نظریاتی استفادہ کیا گیا ہو تو تقاضائے دیانت و تحقیق یہی ہے کہ ان مصادر و مراجع کی نشاندہی کر دی جائے جن سے استفادہ کر کے اس نے یہ افکار و نظریات قائم کئے ہیں۔

اقتباسات میں اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ نہ ہوں بلکہ ناگزیر موقع و مقام پر بقدر ضرورت کے اندازہ سے ہی لئے جائیں تاکہ مقالہ محقق کے ذاتی اسلوب فکر کا نمائندہ سمجھا جا سکے۔

کسی اقتباس سے اگر کچھ جملے حذف کرنے ہوں تو اسکی جگہ چند نقطے رکھ دینا چاہئے تاکہ وہ محذوف جملوں پر دلالت کریں۔ اقتباسات میں کسی قسم کی تغییر و تبدیلی کا حق کسی محقق کو ہرگز نہیں پہنچتا اور نہ ہی اسمیں موجود علمی نقائص کی اصلاح کا حق اسے حاصل ہوتا ہے۔ اس قبیل کی تمام چیزوں کی جانب صرف حاشیہ میں اشارہ کرنے کا حق ہی اسے حاصل ہے۔ اپنی ذاتی تحقیق اور دوسروں کے تحقیقی نتائج کے مابین اسے ایک حد فاصل قائم کر دینا چاہئے کہ علمی دیانت و امانت کا یہی تقاضا ہے، اور اگر کسی علمی مسئلہ میں اسکی رائے بھی وہی قائم ہو جو متقدمین میں کسی ایک یا چند کی رہی ہو تو حاشیہ میں اس امر کی جانب بھی اشارہ کر دینا چاہئے۔

پیشرو علماء وادباء نے علمی وادبی سرقات سے بھی برحذر رہنے کی تاکید مزید کی ہے چنانچہ مشہور مؤرخ امام مسعودی اپنی شہرہ آفاق کتاب "مروج الذہب" میں یوں رقمطراز ہیں۔

ہم نے مشرق ومغرب اور یمن کے مختصر حالات اپنی کتاب "اخبار الزماں" میں تحریر کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ الدینوری نے بھی ان علاقوں کے جغرافیائی اور تاریخی حالات اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں جنہیں ابن قتیبہ نے اپنی کتابوں میں بلا حوالہ نقل کرکے اپنے ذاتی افکار ونتائج کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ الدینوری بلند پایہ عالم تھے انکی اکثر کتابوں کے ساتھ ابن قتیبہ نے یہی سلوک کیا ہے (ج ۲ ص۲۳۲)

البتہ مسعودی کا ابن قتیبہ پر علمی خیانت کا یہ الزام لگانا محل نظر اور قابل تحقیق ہے کیونکہ مسعودی ایک مشہور ومعروف شیعی عالم ہیں جبکہ ابن قتیبہ اہل سنت والجماعت کے نہ صرف مشہور عالم ہیں بلکہ انہوں نے اہل سنت کے مسلک کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں جابجا شیعوں کے اعتراضات وشبہات کا جواب دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی اپنے شاگرد البوصیری پر بلا حوالہ خود انہیں کی کتاب "تہذیب التہذیب" کی عبارت سے، عمیر بن اسحاق کے سلسلہ میں خود انکی جرح کو رد کرنے پر شدید ملامت کی ہے چنانچہ جب انہوں نے اپنی کتاب "اتحاف المہرۃ الخیرۃ بزوائد المسانید العشرۃ" ابن حجر کے سامنے مراجعہ ونظر ثانی کے لئے پیش کی تو آپ نے اس کتاب کے جزء نمبر ۲ ص۳۵ کے حاشیہ پر یوں لکھا۔

یا أخي هذا كلامي بنصه في تهذيب التهذيب، تأخذه مني فترده علي أما علمت أن الجرح مقدم على التعديل لا سيما إن بيّن السبب وأي سبب أبين من المخالفة أما تعرف ان الحيثية مرعية وأن المراد بإطلاق الضعف عليه هنا ما أتى به من الشذوذ فإنا لله وإنا إليه راجعون (تهذيب التهذيب ج ۸ ص۱۴۳)

اے میرے بھائی! یہ میرا ہی کلام ہے جسے آپ نے میری کتاب "تہذیب التہذیب" سے نقل کرکے میرے ہی خلاف استعمال کیا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ جرح کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہو۔ کسی راوی کے ضعیف ہونے کے لئے ثقہ راویوں کی مخالفت سے بڑھکر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اس حیثیت (ثقہ راویوں کی مخالفت) کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور میں نے عمیر بن اسحاق کو ضعیف اس کے شاذ روایتوں کے بیان کرنے کی وجہ سے ہی قرار دیا ہے۔

حافظ نے اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر (ج ۲ نمبر ص۱۱۲) البوصیری کا تعاقب یوں کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کی جو علت بیان کی ہے وہ ناسخ اور غیر واضح ہے حالانکہ میں نے "الاصابہ" میں اس علت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

حافظ ابن حجر نے صرف اپنے ہی ادبی حقوق کا دفاع نہیں کیا ہے بلکہ دوسروں کے ادبی حقوق کے دفاع میں بھی آپ پیش پیش تھے۔ چنانچہ آپ ابن منجویہؒ پر ان کی کتاب "رجال صحیح مسلم" میں "یحییٰ بن سعید القطان" کے ترجمہ میں بلا حوالہ ابو حاتم کی عبارتوں کو نقل کرنے پر شدید تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هذا الكلام برمته كلام أبي حاتم وابن حبان في الثقات في ترجمة يحيى القطان، وهذا دأب ابن منجويه ينقل كلامه برمته ولا يعزوه إليه (تهذيب التهذيب ج ۱۱ ص۲۲۰)

یہ پوری عبارت ابن حبان کی کتاب "الثقات" میں یحییٰ بن سعید القطان کے ترجمہ کے تحت درج عبارت سے بعینہ ماخوذ ہے۔ ابن منجویہؒ کی عادت ہے کہ آپ انکے پورے کلام کو بلا حوالہ نقل کر لیا کرتے ہیں۔

ہمارے پیشرو علماء، مؤلفین کے ادبی وتالیفی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہی، مؤلف کے کلام اور محققین کی تعلیقات وحواشی کے درمیان تفریق کیلئے رموز والوان کا استعمال کرتے رہے ہیں مثال کے طور پر ابن عبدالہادی کی کتاب "تنقیح التحقیق فی احادیث التعلیق" کے مقدمہ کو دیکھئے جسمیں وہ لکھتے ہیں۔

میں اپنی تحقیق واضافہ کے آغاز میں حرف "ز" اور خاتم پر سرخ دائرے ۰

کو اُکتا ہوں۔ تاکہ میری تعلیقات اور حواشی مؤلف کے کلام سے ممیز و الگ رہیں یقیناً فکر و نظر کی کمی اور حبِ نفس ہی دوسروں کے تالیفی حقوق کو نظر انداز کر کے اس کو اپنے افکار کے طور پر پیش کرنے پر مؤلف کو ابھارتی ہے۔ لیکن اگر ریسرچ اسکالر بے پناہ علمی صلاحیتوں کا مالک ہو تو وہ اپنے تحقیقی میدان میں پیشرو علماء کرام و محققین عظام کے افکار و نتائج کا اعتراف اور ان کی قدر شناسی ضرور کرے گا۔ (الانصاف فی مسائل الخلاف: ص۲۶۴)

تحقیق کا علمی اسلوب۔

ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا از حد ضروری ہے تاکہ مقالہ معلومات و تحقیق کے اعتبار سے معیاری ہو۔

۱۔ مقالہ کی عبارتیں لغوی اور نحوی غلطیوں سے پاک، نیز استعارات و تمثیلات کے تکلف سے دور ہوں۔ نیز ریسرچ اسکالر کو اختصار مخل اور اطناب ممل سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور مقالہ کی کتابت کے وقت ابن الانباری کے اس جملہ کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔

"متی امکن ان یکون الکلام جملة واحدة کان اولی من جعله جملتین من غیر فائدة" الانصاف فی مسائل الخلاف : ۲۶۴

کوئی مدعا ایک جملہ میں ادا کرنا ممکن ہو تو بے فائدہ اس کے لئے دو جملے کی ساخت خلاف اولیٰ ہے۔

۲۔ افکار و نظریات اور معانی کو پیش کرتے وقت انکے تاریخی ارتقاء کا لحاظ کرتے ہوئے ہر فکر کا انتساب اسکے موجد کی جانب کرنا چاہیئے تاکہ مختلف افکار و نظریات کے موجدین اور ان کے تاریخی ارتقاء کے مراحل کا پتہ لگایا جا سکے۔ ہمارے پیشرو علماء نے اس منہج کا بھرپور لحاظ کیا ہے۔ مثال کے طور پر "النکت علی ابن الصلاح" دیکھئے جس میں اس کے مؤلف حافظ ابن حجر العسقلانی ہر فکر اور رائے کو اس کے موجد کی

جانب منسوب کرتے ہیں۔ اس طرح گویا وہ اصول حدیث کی تاریخ وار تقاء میں اس دور کے تمام علماء کے کلیدی کردار کی حیثیت و اہمیت واضح کر دیتے ہیں۔

۳۔ وہ نصوص و روایات جن پر ریسرچ اسکالر نے اپنے مقالہ میں اعتماد کیا ہے ان کی تحقیق کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ محقق ہے نصوص و روایات کا ناقل و راوی نہیں۔ لہٰذا نصوص و روایات کے سامنے خود سپردگی درست نہیں ہے بلکہ ان پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۴۔ مصادر و مراجع کا استعمال ان کے تخصص کے اعتبار سے مقالہ کی اہمیت کو دوچند اور اس پر قاری کے اعتماد کو مضبوط کرتا ہے۔ اسی لئے حافظ ابن حجر نے علامہ ابن الصلاح پر تعجب کرتے ہوئے تنقید کی ہے کہ انہوں نے فن حدیث سے متعلق یک بات کو امام حاکم سے روایت کرنے کے بجائے ابو عمرو الدانی سے کی ہے اور چونکہ مسالہ کا تعلق فن حدیث سے ہے اور امام حاکم ائمہ حدیث میں سے ہیں لہٰذا انکی کتاب کا حوالہ امام دانی کی کتاب کے مقابلہ میں زیادہ اولیٰ تھا۔

۵۔ حوالہ جات میں قدیم ترین مصدر کا حوالہ دینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ اسی لئے حافظ ابن حجر نے اپنے شیخ امام عراقی پر اس امر کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے شدید تنقید کی ہے کہ انہوں نے ایک روایت کو ابن عبدالبر کے واسطہ سے نقل کیا ہے جبکہ اس حدیث کی روایت ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں اور امام طحاوی نے "شرح معانی الآثار" میں اور امام جوزقی نے "المتفق" میں کی ہے۔ لہٰذا اس روایت کا انتساب ان تینوں ائمہ میں سے کسی کی جانب کرنا ابن عبدالبر کی جانب منسوب کرنے سے زیادہ بہتر تھا کیونکہ وہ ان تینوں اماموں کے بعد کے عصر سے تعلق رکھتے ہیں۔

۶۔ افکار و معانی اور موضوع کے اصول و مبادی اور اس کے جزئیات و فروعات کے درمیان منطقی ربط کا لحاظ ضروری ہے۔ نیز درج ذیل قواعد کا لحاظ رکھنا درس اور دقیق علمی مباحث و مقالات کیلئے ناگزیر ہے۔

جیسے "الف" "من تمسک بالاصل خرج عن عهدة المطالبة بالدليل"
کسی مسئلہ میں اگر کوئی قاعدہ کلیہ سے استدلال کر رہا ہو تو اس سے دلیل کا مطالبہ بے معنی ہے۔

"ب" "من عدل عن الاصل افتقر الی اقامة الدليل"۔
جو شخص قاعدہ کلیہ سے اعراض کرتے ہوئے کوئی مسئلہ بیان کرے تو وہ دلائل وشواہد پیش کرنے کا ذمہ دار ہے۔

"ج" "الدليل اذا تطرق اليه الاحتمال بطل به الاستدلال" الانصاف فی مسائل الخلاف ص۳۲۔
جب کسی دلیل میں مختلف احتمالات کی گنجائش ہو تو اس سے استدلال درست نہیں ہے۔

۷۔ ریسرچ اسکالر کو شرعی، لغوی اور اجتماعی علوم وفنون کی تحقیق میں تقابلی تحقیق کا اسلوب استعمال کرنا چاہیے کیونکہ تقابلی مطالعہ، علوم طبیعیہ میں تجربہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور اسے ہر طرح کے فقہی، گروہی اور جماعتی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر تحقیق کا کام انجام دینا چاہیے۔ اسی لئے مقالہ کے نتائج وخلاصہ کو شروع میں نہیں بلکہ مقالہ کی تکمیل کے بعد درج کیا جاتا ہے۔

۸۔ بحث وتحقیق کے دوران غیر ضروری تمہیدوں اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ قارئین کا وقت بلا فائدہ ضائع نہ ہو اور نہ ہی انہیں ملال واکتاہٹ کا احساس ہو۔ افکار ومعانی کے درمیان عقلی ومنطقی ربط رکھنے کی خاطر عموماً وہ چیزیں جو اصل موضوع سے زیادہ متعلق نہیں ہوتی ہیں انہیں حاشیہ پر درج کیا جاتا ہے۔ اور اگر حواشی ان کا بار نہ برداشت کر پا رہے ہوں تو آخر میں انہیں بطور ضمیمہ کے شامل کر دیا جاتا ہے۔

حواشی کا مقصد حوالہ جات کے لئے جگہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان نصوص وافکار کے لئے جگہ فراہم کرنا بھی ہے جنکی تفصیلات کو مقالہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا

جیسے کسی امر کے اثبات یا نفی کے بیشمار دلائل ونمونے نیز حواشی کا استعمال ان تشریحات وتعلیقات کیلئے بھی کیا جاتا ہے جن کا نفس موضوع سے گہرا ربط تو نہیں ہوتا ہے لیکن جنکی توضیح وتشریح کے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا۔

وہ بحثیں جو تفصیل سے مقالہ کے پچھلے ابواب میں آچکی ہوں اور پھر دیگر ابواب میں ان کے اعادہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو حد درجہ اختصار کے ساتھ ذکر کرکے حاشیہ میں اس کی اس جگہ کی جانب اشارہ کر دیا جاتا ہے جہاں اس پر مکمل ومفصل بحث موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح الفاظ غریبہ کی شرح، مختلف جگہوں یا اعلام کی توضیح کیلئے بھی حاشیہ کو استعمال کیا جاتا ہے اور تفصیل کیلئے اس موضوع سے متعلق کتابوں کی جانب اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

۹۔ جن عناوین پر پہلے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان عناوین پر مقالہ لکھنے والے ریسرچ اسکالر کو ان پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کرنا چاہیے جو پچھلے مقالوں میں تشنہ، ادھورے یا غامض رہ گئے ہوں۔

۱۰۔ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کو ان کے اپنے مخصوص مفہوم ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ اور نئی اصطلاحات کی دقیق اور جامع ومانع تعریف پیش کرنی چاہیے، خواہ وہ تعریف کسی علمی اکاڈیمی نے وضع کی ہو یا ریسرچ اسکالر کی خود اپنی وضع کی ہوئی ہو۔

۱۱۔ مقالہ کی ہر فصل کی تکمیل کے بعد اسے مشرف کے پاس نظر ثانی کے لئے پیش کرنا چاہیے تاکہ مشرف اس سے متعلق اپنے مشوروں اور تجاویز کو پیش کر سکے اور پھر وہ ان مشوروں اور تجاویز کو روبہ کار لاتے ہوئے از سر نو اس فصل کی آبیاری کر سکے اور اسی طرح مقالہ کی تمام فصلوں کو دکھاتا رہے یہاں تک کہ مقالہ مکمل ہو جائے۔

جو ہو عزم سفر پیدا

سید جلال الدین عمری
مرتب: محمد اسمٰعیل فلاحی

۳۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو ناظم اعلیٰ حضرت مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی نے شعبہ اعلیٰ کے تمام اساتذہ وطلبہ کے سامنے درج ذیل خطاب فرمایا۔ خطاب سے پہلے صدر جامعہ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب نے افتتاحی کلمات میں اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر برائے تربیت جناب مولانا سید جلال الدین عمری ہندوستان کے جید اور مستند علماء میں ہیں۔ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنی گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود، جامعہ سے تعلق خاطر کی بنا پر اس کی سرپرستی قبول فرمائی، ہمیں آپ کی بات اس حیثیت سے نہیں سننی ہے کہ آپ صرف ہمارے ناظم ہیں بلکہ آپ ہمارے معلم، مربی اور قائد ہیں اور اسی حیثیت سے آپ کی بات کو حرز جاں بنانا ہے۔

مولانا انفر عمری صاحب نے فرمایا ایک مصروف آدمی پر بھاری ذمہ داری ولی گئی ہے، اس توقع پر میں نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ آپ سب میرا تعاون فرمائیں گے۔ کوئی بڑا پتھر ہو، اسے تنہا ایک آدمی نہیں ہٹا سکتا، چاہے کتنا بڑا آدمی ہو، بلڈنگ ایک آدمی نہیں کھڑی کر سکتا، بادشاہ وقت بھی نہیں، اس کا پیسہ لگے اور مزدور اور دوسرے کارندوں کا پسینہ ملے گا تب جاکر بلڈنگ کھڑی ہوگی۔ میں نے آپ کے تعاون کی امید پہ یہ بارگراں اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

عزیزو! آج دنیا میں اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں، پہاڑ جیسی رکاوٹیں ان رکاوٹوں کو تنہا ایک آدمی دور نہیں کر سکتا، ضرورت ہے کہ وہ سب لوگ، جنکے اندر یہ تمنا اور آرزو ہے کہ باطل کا پرچم سرنگوں اور حق کا پرچم سربلند ہو، یہ سب

مل کر کوشش کریں۔ مجھ جیسے کمزور و ناتواں بوڑھے آدمی کی بھی ضرورت ہے اور آپ جیسے جوانوں کی بھی۔ بتائیے آپ ساتھ دیں گے؟

(ایک ساتھ بہت سی آوازیں انشاء اللہ)

مولانا نے فرمایا تب آپ کو بڑی محنت کرنی ہوگی، زندگی لگانی ہوگی، مجھلی کوئی ایک دن میں نہیں بنتا، گانے والے بعض کھانے برسوں چھوڑ دیتے ہیں کہ ان سے آواز متاثر ہوگی۔ دہی نہیں کھاتے، ترشی نہیں کھاتے، آواز کو باریک کرنے کے لئے گردن تک پانی میں کھڑے رہتے ہیں، تب جاکر آواز سریلی ہوتی ہے، کوئی مودودیؒ، کوئی حسن البناؒ، کوئی ابواللیثؒ، کوئی صدرالدین ایک دن میں نہیں بنا، زندگیاں کھپادی ہیں تب جاکر معلوم ہوا کہ یہ ابواللیث ہیں، مودودی ہیں، صدرالدین ہیں۔ اگر شروع سے کھیل کود میں لگ جاتے تو کبھی اس مقام بلند پر نہیں پہونچ پاتے۔

آپ کی عمر وہ ہے کہ ہر طرف سے آپ کو آواز دی جا رہی ہے، آپ کے پاس طاقت ہے، جسمانی اور دماغی صلاحیت خریدنے کے لئے ایک دنیا کوشش کر رہی ہے دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنی توانائیوں کو کہاں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ جب میں آپ کی طرح تھا، کہا کرتا تھا کہ لڑکا پڑھنے سے نہیں تھکتا ہے، بیچارا تھوڑی ہی چلا رہے ہیں کہ تھک جائیں، اب یہ صورت حال نہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھ سکتا، ۴ موٹی کتابیں اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھ دوں تو ہاتھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔

کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ آپ دائیں بائیں نہ دیکھیں، ہر وہ شخص جو آپ کو آپ کے مقصد سے پھیرنے کی کوشش کرے، آپ کا دوست نہیں، دشمن ہے۔ آپ دین کا علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ ہر اس معروفیت کو چھوڑ دیجئے جو اس میں رکاوٹ بنے ٪۳۳ فیصد نمبر حاصل کرنا کامیابی نہیں۔ مجھے خوشی اس وقت ہوگی جب ہر بچہ ٪۸۰ فیصد نمبر حاصل کرے، فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کس کو ترجیح دوں۔ آپ جھاڑو دیں، سائیکل لگائیں یا اس طرح کا کوئی اور کام کریں، مجھے اس سے دلچسپی

نہیں، آپ لائبریری میں کتنا بیٹھے، مشکل مضامین اور مشکل اشعار حل کرنے میں کتنا وقت لگایا۔ مجھے اس سے خوشی ہوگی۔

یاد رکھئے آپ کو بہت سے لوگ کھینچ رہے ہیں، بازار کھینچ رہا ہے، سبق آواز دے رہی ہے، غلط قسم کے طلبہ پکار رہے ہیں، ہر اس شخص سے دور رہئے جو آپ کو آپ کے مقصد سے ہٹا دے۔ آپ کا دوست تو وہ ہے جو بتائے کہ ۹ بج گئے، دیکھو جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، پڑھنا ہے۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے، زندگی میں پانچ چھ سال ملے ہیں، قدرت کا یہ قانون ہے کہ ان پانچ چھ سالوں میں محنت کرو، زندگی بھر آرام کرو اور اگر انہیں ضائع کر دو تو زندگی بھر نقصان اٹھاؤ۔ ان پانچ چھ سالوں کی اگر آپ قدر کر لیں تو ہیرا بن سکتے ہیں۔

عزیزو! تعلیم سے ہٹانے والی ہر مصروفیت، ہر اختلاف اور ہر فتنے سے دور رہئے۔ فرض کیجئے میرے اور کسی کے درمیان جھگڑا ہے۔ آپ نے تحقیق میں تین دن صرف کئے۔ سوال یہ ہے کہ تین دن لگانے سے آپ کو ملا کیا؟ سوائے اس کے کہ معلوم ہوا کہ میں خراب آدمی ہوں یا اچھا، وقت تو آپ کا برباد ہوا۔ ماں باپ کو اس سے دلچسپی نہیں کہ عنایت اللہ صاحب خراب ہیں، رحمت صاحب ایسے ہیں، وہ تو یہ کہیں گے رزلٹ کیسا ہے بتاؤ، یہ تنظیم، وہ جماعت، یہ ایسا، وہ ایسا، اس سے کیا لینا دینا۔ ان سب چیزوں کو بھول جائیے انہیں بھولیں گے تو میرا نقصان نہیں، عنایت اللہ صاحب کا نہیں، آپ کا نقصان ہوگا۔ جن لوگوں نے آپ کی عمر میں غفلت کی، آج روتے ہیں، افسوس کرتے ہیں، قدم قدم پر ان کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، اگر وقت ہو تو ان کاموں میں دلچسپی لیجئے جو اس مقصد سے ہم آہنگ ہوں، مثلاً پہلے کوئی مقرر نہیں تھا، میں سنوں کہ اب دس مقرر ہو گئے ہیں، مضامین لکھے گئے، چھپ گئے۔

عزیزو! اللہ نے چاہا تو میں آتا رہوں گا، آپ کے اندر تبدیلی آجاتی

چاہیئے۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب خوشخبری سنائیں کہ تبدیلی آگئی ہے اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ دیکھو یہ ہمارا مفتی ہے، محدث ہے، یہ مورخ ہے، عربی یا اردو کا ادیب ہے، قرآن کا مفہوم جاننا چاہو تو اس سے سمجھو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ اپنے کو گھلا دیں۔

اس خطاب سے پہلے کلیۃ البنات میں معلمات اور طالبات کے سامنے مولانا کا خطاب ہو چکا تھا۔ مولانا نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ آج باتیں کرنے کا موقع مل رہا ہے، دو چار باتیں رکھتا ہوں، ان کا خیال رکھیں گی۔

۱۔ جامعۃ الفلاح جس پاکیزہ مقصد کیلئے قائم ہوا ہے ہم سب کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ مقصد پورا ہو، وہ مقصد مختصراً یہ ہے کہ کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کرکے، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو بنانے اور اپنے ماحول کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ ایک بڑا مقصد ہے، طالبات کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ان کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے براہ راست استفادہ کرنا اور اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے، اس معاملہ میں گھر اور ماحول کی پرواہ نہیں کرنی ہے۔ آج دین پر چلنا مشکل ہے، جب فضا خراب ہوتی ہے تو ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ایسا دور آئے گا کہ دین کا معاملہ ایسا ہی مشکل ہو جائے گا جیسا انگارہ ہاتھ میں لینا۔ ہماری کوشش ہو کہ ہر مشکل کے باوجود ہم اپنے کو دین کا پابند بنانے کی کوشش کریں گے۔ اللہ کے دین پر عمل کرنے ہی میں ہماری کامیابی ہے۔ طالبات محسوس کریں کہ معلمات اس معاملہ میں سنجیدہ ہیں، وہ جو بتاتی ہیں خود بھی اس پر عمل کرتی ہیں۔

۲۔ معلمات سے درخواست ہے کہ ان کے گھر کا ماحول اسلامی ہو، کوئی دیکھے تو کہے کہ اس گھر میں کوئی بھی کام اللہ کے رسول کی سنت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

عبداللہ بن مسعود فقہائے صحابہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، مسلم شریف

ہیں ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ تقریر میں انہوں نے کہا کہ نبیؐ نے عورتوں کو اس سے منع فرمایا ہے کہ عورتیں مصنوعی بال لگائیں، ایک خاتون نے کہا کہ آپ کے گھر میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا دھوکہ ہوا ہوگا۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا واقعی دھوکہ ہوا تھا، عبداللہ بن مسعود نے کہا کوئی عورت رسول اللہ کے حکم کی مخالفت کرے اور عبداللہ بن مسعود کی بیوی بنی رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یہاں بچیاں اپنی معلمات کو دیکھیں کہ نہ صرف تبلیغ کرتی ہیں بلکہ وہ خود پابند ہیں، لباس، رہن سہن سب اسلامی، اور اس ادارہ کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہے۔

ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہماری لڑکیوں کا معیار کسی سے کم نہ رہے ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ عورتوں نے محنت کی تو آگے بڑھیں۔ اس دور میں عام طور سے لڑکیوں کا ریزلٹ لڑکوں سے اچھا آتا ہے۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لڑکیوں نے شوہروں کو پڑھایا، دین کی باتیں بتائیں، ہماری کوشش ہو کہ ہماری لڑکیاں کسی پہلو سے لڑکوں سے پیچھے نہ رہیں، نہ علمی نہ عملی۔

کہا جاتا ہے ایک مرد کی اصلاح ایک شخص کی اصلاح، ایک لڑکی کی اصلاح ایک گھر کی اصلاح، کسی نے کہا تھا کسی قوم کی تہذیب اور مزاج بدلنا چاہتے ہو تو اس کی لڑکیوں کو ہمارے حوالہ کر دو، ہمارا مزاج بدلا ہے، اس میں اسی بات کو دخل ہے۔

بقیہ:- لیل و نہار

ایک فلاحی عبدالعظیم آکولوی کے والد محترم انتقال کر گئے۔ موصوف ایک نیک انسان تھے۔ عبدالعظیم آکولوی کے غم میں ادارہ شریک ہے اور مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

رودادِ انجمن

۱۷؍۵؍۹۶ء کو مجلس شوریٰ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا اجلاس جامعہ میں ہوا۔ مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی (صدر)، مولانا محمد عمران صاحب فلاحی (سکریٹری)، مولانا ظہیر عالم صاحب فلاحی، مولانا نور محمد صاحب فلاحی، مولانا نسیم غازی صاحب فلاحی، مولانا منور حسین صاحب فلاحی اور مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی شریک اجلاس ہوئے۔

اجلاس کا ایجنڈا تھا اجلاس عام ششم سے متعلق تیاریوں کا جائزہ، سالانہ رپورٹ، انجمن کا گوشوارہ آمد و صرف جون ۱۹۹۵ء تا اپریل ۱۹۹۶ء سالانہ بجٹ، انجمن کی جیب کا تفصیلی حساب آمد و صرف۔

جناب نسیم غازی صاحب کی تلاوت کے بعد گذشتہ کارروائی کی خواندگی ہوئی۔ جائزہ کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی کہ انجمن کی جیب کا دعوتی استعمال کوئی خاص نہیں ہوا۔ مولانا مطیع اللہ صاحب کی عدم موجودگی کی بنا پر سبب معلوم نہ ہو سکا طالبات کی تنظیمی ہیئت کے بارے میں کمیٹی کو نظر ثانی شدہ رپورٹ پیش کرنی تھی لیکن ترسیل ابلاغ کی خامی کی وجہ سے پیش نہ ہو سکی۔ اس کمیٹی کے کنوینر نسیم غازی صاحب نظر ثانی کر کے آئندہ اجلاس میں اسے پیش کریں گے۔ طے پایا کہ اجلاس کی تبدیل شدہ تاریخوں کی اطلاع متعلق اداروں اور طلبہ تنظیموں کو پہلی فرصت میں کر دی جائے۔ اور سہ روزہ دعوت دہلی میں بھی اس کا اعلان آ جائے۔ جامعہ سے انجمن بادہ کیلئے جو زمین ملی ہے، اس کی جگہ مناسب نہ ہونے کی بنا پر طے کیا گیا کہ انتظامیہ سے گذارش کی جائے کہ اس کو جامعہ کے اندر سڑک سے متصل زمین سے بدل دیا جائے۔ واضح رہے کہ اس کے بعد انتظامیہ سے درخواست کی گئی لیکن فی الحال اندرون احاطہ

کسی زمین پر اتفاق نہ ہو سکا البتہ کسی بھی مناسب زمین سے اس کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔

اجلاس عام کے سابقہ پروگرام میں مباحثے کے بعد جزوی ترمیم کی گئی۔ طے پایا کہ اجلاس کا افتتاح جمعہ کے قبل دس بجے اور دارالاقامہ کلیۃ البنات کا افتتاح بعد نماز جمعہ ہوگا۔ سمینار کا مرکزی عنوان "عصر حاضر میں علماء کی خدمات" ہوگا۔ مقالہ نگاروں میں مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب، مولانا محمد طاہر مدنی صاحب، مولانا شمس پیرزادہ صاحب، مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد اور مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے نمائندے بھی ہونگے۔

انجمن کی سالانہ رپورٹ پیش ہوئی۔ گوشوارہ آمد وصرف خازن کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیش نہیں ہو سکا۔ وہ ایک ہفتہ کے اندر انشاء اللہ گوشوارہ پیش کر دیں گے۔ جس کی کاپیاں تمام ارکان شوریٰ کو بھیج دی جائیں گی۔ جیپ کی آمدنی کا حساب پیش کیا گیا۔ جیپ کے قرض کی ادائیگی کے بارے میں طے ہوا کہ اس کی قسط وار ادائیگی آمدنی سے حسب گنجائش کی جائے گی۔ جناب مولانا عبدالعظیم صاحب فلاحی کو اجلاس عام کا جملہ حساب کا ذمہ دار مقرر کیا گیا ہے۔ مجلہ حیات نو کے لئے طے پایا کہ مولانا عبدالبر صاحب فلاحی کی جگہ بطور اڈیٹر مولانا طارق فاروق کلیم صاحب فلاحی کو رکھا جائے۔

اجلاس عام کا مجوزہ پروگرام:۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۶ء جمعیۃ الطلبہ کا پروگرام بعد نماز عشاء، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۶ء ۱۰۔۱۲ بجے دن افتتاحی اجلاس کنوینر مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی۔ صدارت مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی، صدر انجمن، تلاوت کلام پاک مولانا جاوید سلطان صاحب فلاحی۔ ترانہ جامعہ ..... خطبہ استقبالیہ۔ ناظم اجلاس، افتتاحی کلمات امیر جماعت اسلامی ہند، رپورٹ انجمن مولانا محمد عمران صاحب فلاحی سکریٹری انجمن، خطبہ صدارت صدر انجمن، افتتاح دارالاقامہ بعد نماز جمعہ کنوینر مولانا طارق اکرام اللہ صاحب فلاحی، استقبالیہ

صدر جامعہ۔ وقفہ عصر تا عشاء۔ خطبہ عام۔ کنوینر جناب عبدالعزیز سلفی صاحب فلاحی۔ مقررین جناب ولی اللہ سعیدی صاحب فلاحی، مولانا سید جلال الدین صاحب عمری ناظم جامعہ۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۹۶ء۔ درس قرآن بعد نماز فجر مولانا محمد عنایت اللہ صاحب سبحانی سمینار بعنوان "عصر حاضر میں علماء کی خدمات" پہلا سشن ۸ تا ۱۲ بجے کنوینر ڈاکٹر عبیداللہ فہد صاحب فلاحی۔ صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب۔ دوسرا سشن ۲ تا ۴ بجے کنوینر ڈاکٹر اطہر ریحان صاحب فلاحی صدارت..... تیسرا سشن بعد نماز عشاء کنوینر مولانا امیر احسن صاحب فلاحی، صدارت پروفیسر علاؤ الدین صاحب وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی۔

متوازی پروگرام طالبات کا سمپوزیم بعنوان "تعمیر معاشرہ اور خواتین"۔ ناظمہ ساجدہ ابواللیث فلاحی صدارت ..... عناوین، علوم اسلامیہ اور خواتین، ملکی سیاست اور خواتین، عورت کی سماجی حیثیت، تربیت اطفال اور خواتین، تعلیم نسواں اور اس کے مسائل، فارغات اور تحریک اسلامی وغیرہ

۲۷ر اکتوبر ۱۹۹۶ء بعد نماز فجر درس حدیث مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی تنظیمی اجلاس زیر صدارت (صدر انجمن) کنوینر (سکریٹری انجمن) تعارف ابنائے قدیم، سوالات، تجاویز و مشورے۔ انتخاب زیر نگرانی مولانا نسیم احمد غازی صاحب فلاحی بعد نماز عصر تقریب سنگ بنیاد انجمن ہاؤس، بعد عشاء ادبی نشست، کنوینر ڈاکٹر انور کمال صدیقی فلاحی (۱) مقالہ ادب اسلامی اور عہد حاضر۔ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم/منور حسین فلاحی (۲) افسانہ/خاکہ ..... (۳) شعری نشست شعراء کرام۔

طالبات کی متوازی تنظیمی نشست و انتخاب۔ کنوینر ساجدہ ابواللیث فلاحی سنہ ۱۹۹۶ء-۱۹۹۷ء کا بجٹ پیش کیا گیا جسے شوریٰ نے منظوری دی۔

اجلاس شوریٰ میں سکریٹری انجمن مولانا محمد عمران صاحب فلاحی (۱۱ مئی ۱۹۹۵ء تا ۱۲ مئی ۱۹۹۶ء) کی پیش کردہ سالانہ رپورٹ درج ذیل ہے۔

۱۔ اندرون ملک فلاحی برادران کے نام ایک سو پچاس اور بیرون ممالک فلاحی برادران کے نام ساٹھ اور غیر فلاحی برادران کے نام دس خطوط ارسال کئے گئے۔ ان کی طرف سے آنے والے خطوط کی تعداد پچیس ہے۔

۲۔ اس دوران مجلس شوریٰ کی نشست ایک اور مقامی فلاحی برادران کی نشستیں پانچ ہوئیں۔

۳۔ سیشن ۹۴-۱۹۹۵ء فضیلت کرنے والے طلبہ کو انجمن کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا اور انہیں دستور انجمن اور ممبری فارم دیئے گئے۔ تقریباً سبھی نے فارم پر کئے اور انجمن کے ممبر بنے۔

۴۔ مجلس انتظامیہ جامعۃ الفلاح سے بار بار درخواست کے بعد انجمن ہاؤس کیلئے پلاٹ حاصل کر لیا گیا ہے۔ اب اگلا کام ممبران انجمن کا ہے تاکہ جلد از جلد اسکی تعمیر مکمل ہو سکے۔

۵۔ علی گڑھ کے بعض طلبہ کو وظائف (تعلیمی قرض) دیئے گئے۔

۶۔ جامعہ کے مستحق طلبہ اور دیگر کارکنان کی مالی امداد کی گئی۔

۷۔ طلبہ کی طبی امداد کیلئے ایک نظم قائم کیا گیا اور اسکے لئے ماہانہ رقم مختص کی گئی ہے۔

۸۔ مجلہ حیات نو برابر نکل رہا ہے۔ البتہ مالی پریشانی کی وجہ سے کبھی کبھی کئی ماہ کا مشترکہ شمارہ نکالنا پڑتا ہے۔

۹۔ حیات نو اور انجمن کے دوسرے کاموں کیلئے انجمن کی مستقل آمدنی کا ہونا ضروری ہے۔ ہم نے اس طرف خصوصی توجہ دی۔ مختلف یونٹوں سے خط و کتابت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ ابتدائی کامیابی مل گئی ہے۔ ہماری ایک یونٹ نے سبقت کی ہے اور اسکے ممبران نے طے کیا ہے کہ ماہانہ چار ہزار برائے حیات نو اور ایک ہزار جامعہ کے نادار طلبہ کی ہنگامی ضرورت کیلئے وہ دیا کریں گے۔ اس یونٹ نے جنوری ۹۶ء سے اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے۔ اسی یونٹ نے اجلاس عام کیلئے بھی ایک خطیر رقم بھیج کر مزید خلوص و نیت کا ثبوت دیا ہے۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

تعارف و تبصرہ

میرا پیام اور ہے

مصنف: مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

قیمت: ۲۰ روپیے

کتابت و طباعت: عمدہ

صفحات: ۱۱۲

ناشر: ادارہ احیائے دین۔ بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی)

یہ کتاب مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کے ان منتخب خطبوں کا مجموعہ ہے جو بلریا گنج کی عیدگاہ میں عید الفطر اور عید قرباں کے مواقع پر وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں۔ یہ خطبات اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے اندر ایمان کا مفہوم، قرآن کا پیغام، اسلام کے تقاضے اور مسلمانوں کے فرائض بڑے موثر اور دردمندانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

ان خطبات میں سے ہر خطبہ اپنی جگہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے اندر اسلامی حمیت اور ایمانی حرارت بھی ہے، بیداری کا پیغام اور جہد و عمل کی دعوت بھی ہے، عالمانہ وقار اور قائدانہ جلال بھی ہے، زبان و ادب کی چاشنی اور خطابت کی سحرکاری بھی ہے۔ غرض وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک کامیاب خطبے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی خطبہ ایسا نہیں ہے جسے پڑھتے ہوئے آدمی کی آنکھیں نم نہ ہو جائیں دل کی دنیا میں ایک ہلچل نہ مچ جائے اور آدمی کچھ دیر سوچنے اور اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ بطور نمونہ چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

"آہ کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں اپنے مومن و مسلم ہونے کا دعویٰ ہے؟ یہ کیسی ایمان و یقین کی جان کنی ہے کہ خود ان کے گھروں سے اسلام کی

مظلوموں کی چیخیں اور دل دوز فریادیں سنائی دے رہی ہیں! خود ان کی زندگیاں، ان کے متعلقین کی زندگیاں، ان کے بہن بھائیوں کی زندگیاں اور ان سب کا طرز رہن سہن اسلام کے خلاف ایک کھلا ہوا احتجاج ہے۔

آہ کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں اپنی غیرت و خود داری پر ناز ہے، کیا یہ غیرت و خود داری کی موت نہیں کہ ان کے جیتے جاگتے، خود ان کی نگاہوں کے سامنے ان کا محبوب دین اجنبیت اور کس مپرسی کے لمحے گذار رہا ہے مگر ان کے سکون میں کوئی خلل نہیں پڑتا اور وہ چین کی میٹھی نیند میں سو رہے ہیں۔" صفحہ ۲۱

مولانا سبحانی ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں۔

" آخر آپ دوسری قوموں سے اس طرح مرعوب کیوں ہوتے ہیں؟ ان کی وضع قطع اور ان کی تہذیب پر اس قدر فریفتہ کیوں ہوتے ہیں؟ آپ کو آپ کے رب نے اسلام جیسی شاندار اور دلکش تہذیب عطا کی ہے، اس تہذیب کو چھوڑ کر آپ دوسری ناکارہ تہذیبوں کی طرف کیوں لپکتے ہیں؟

اگر آپ کے پاس حریر و کمخواب کی انتہائی حسین پوشاک موجود ہے تو آپ دوسروں کے ٹاٹ اور گدڑی پر کیوں ریجھتے ہیں؟ اگر آپ کے صحن میں صاف شفاف شیریں پانی کے چشمے رواں ہیں تو آپ دوسروں کے گندے نالوں سے اپنے کوزے کیوں بھرتے ہیں؟ اگر آپ کے اپنے گھر میں برقی قمقمے جگمگا رہے ہیں تو آپ دوسروں کے ٹمٹماتے ہوئے دیا سے کیوں روشنی حاصل کرتے ہیں؟ اگر آپ کے ہاں ثمر بہشت اور شیریں انگور کے باغ موجود ہیں تو آپ دوسروں کی کڑوی کسیلی جھربیریوں پر کیوں ٹوٹتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے، اس زمین پر اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں۔۔۔" صفحہ ۳۲

یہ اس کتاب کے چند فقرے ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے تمام فقرے اور تمام خطبے اپنے اندر یہی شان اور یہی دلآویزی یہی حرارت اور یہی تاثیر رکھتے ہیں۔ ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنی خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت اور اپنے انقلاب آفریں مضامین کے پیش نظر اس قابل ہے کہ کوئی گھر اور کوئی لائبریری اس سے خالی نہ رہے۔

ہم ادارہ احیائے دین بلریا گنج کو اس کی اس تازہ اور گراں قدر پیشکش پر مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ منبر فلاح سے دیئے جانے والے مولانا سبحانی کے خطبوں کو بھی محفوظ کرنے اور ان کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کا کوئی سامان ہو کہ یہ ملت کا سرمایہ ہیں اور ملت کی نشاۃ ثانیہ میں ان سے زبردست خدمت لی جا سکتی ہے۔

غزل

محمد ظفر اعظمی

چمن میں پھیلی ہوئی کیسی وہ ہوائیں تھیں
شگفتہ پھولوں کی بکھری ہوئی قبائیں تھیں
فغاں میں ڈوبی ہوئی کیسی وہ صدائیں تھیں
ہمارے شہر کی سہمی ہوئی فضائیں تھیں
صداقتوں کا بھرم جس کے دم سے تھا قائم
صلیب و دار کی اس کیلئے سزائیں تھیں
میں کیسے بچتا نہ دشمن کے وار سے آخر
کہ باپ ماں کی میرے ساتھ جب دعائیں تھیں
ہر ایک گام پہ سایوں کا ایک لشکر تھا
ہر ایک سو چھائی ظفر ظلم کی گھٹائیں تھیں

عبد البر اثری فلاحی

"دروس اللغة العربية لغير الناطقين بها" کی "کتاب المعلم"

از :- ڈاکٹر ف عبد الرحیم

الجزء	صفحات	قیمت
الاول	۷۶	۳۰ روپے
الثانی	۱۳۲	۵۰ روپے
الثالث	۹۰	۳۶ روپے

کتابت وطباعت :- عمدہ

ناشر :- اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ ۷۸، پیرسیعد پانی روڈ مدراس-۶۰۰۰۱۲ فون ۶۴۴۳۴

ڈاکٹر ف عبد الرحیم صاحب مدظلہ العالی کوئی نیا نام نہیں۔ اس سے قبل آپ کی متعدد کتب کا انہیں صفحات میں تعارف کرایا جا چکا ہے۔ آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں استاد ہیں۔ وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے انہیں راست طریقۂ تعلیم DIRECT METHOD کے اصولوں کے مطابق عربی زبان سکھانے کیلئے آپ نے "دروس اللغة العربية لغير الناطقين بها" کے نام سے کتاب تیار کی تھی۔ بحمد اللہ کافی مقبول ہوئی اور متعدد ممالک میں شامل نصاب ہوئی۔ زیر تعارف کتاب اسی کی گائڈ بک ہے۔ جو در اصل اس کتاب کو پڑھانے والے اساتذہ کی رہنمائی اور سہولت کیلئے تیار کی گئی ہے۔ ابتداء میں کچھ اجمالی ہدایات دی ہیں پھر ہر تمرین کی غرض و غایت بتلاتے ہوئے اُسے ذہن نشین کرانے کا طریقہ بتایا ہے۔ نیز ان وسائل کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جن سے پڑھاتے وقت مدد لینی چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک خوش آئند خبر یہ

ہے کہ مصنف نے بذاتِ خود ان اصولوں کے مطابق تعلیم دے کر عملی تجربہ بھی کیا ہے اور اس کی وڈیو کیسٹ بھی تیار کرائی ہے جس سے استاد و طالب علم دونوں کو کافی سہولت ہوگی۔ توقع ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے گا خصوصاً میں چاہوں گا کہ وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو کم وقت میں ضروری حد تک عربی زبان کی واقفیت بہم پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ کم از کم قرآن و سنت براہِ راست سمجھ سکیں وہ ضرور اس تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے لئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اللہ مصنف کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

نعت

فرحت حسین خوشدل

آپؐ آئے تو یہاں شمس و قمر روشن ہوئے
آپؐ ہی کے فیض سے دیوار و در روشن ہوئے

آپؐ جب آئے تو دنیا کو ملی غم سے نجات
آپؐ کے آتے ہی دنیا کے نگر روشن ہوئے

آپؐ کی خاطر خدا نے دو جہاں پیدا کیا
آپؐ ہی کے نور سے سارے بشر روشن ہوئے

آپؐ نے انسان کو پیغام وحدت کا دیا
آپؐ کے پیغام سے قلب و نظر روشن ہوئے

عشقِ احمد کی بدولت ہم ہوئے ہیں اب جنتی
ہم کہ بھٹکے تھے اب سب کے گھر روشن ہوئے

دل کے اندر کفر کی جو تیرگی تھی دوستو
معجزہ شق القمر کو دیکھ کر روشن ہوئے

آپؐ کی تعلیم کا دنیا نے دیکھا یہ اثر
حیدرؓ و عثمانؓ عمرؓ اور بوبکرؓ روشن ہوئے

کیجئے تعریف جتنی ہے یہ قصہ مختصر
آپ آئے تو جہاں کے بحر و بر روشن ہوئے

سچ کہا ہے تو نے خوشدل مصطفیٰؐ کی شان میں
عشقِ احمدؐ جن کے دل میں ہے وہ گھر روشن ہوئے

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

جمعیت کے نئے سرپرست

طلبہ جامعہ کی انجمن جمعیۃ الطلبہ کا ایک سرپرست ہوا کرتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی استاد شعبہ اعلیٰ نے طلبہ کے مفاد کے پیش نظر یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

جمعیت کا انتخاب

ہر سال طلبہ اپنی جمعیت کے لئے عربی ششم سے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ اس سال سنہ ۹۴-۹۵ء کے سیشن کیلئے انہوں نے سید نظام الدین رائیس، ڈبلہ راجہ کو اپنا سکریٹری منتخب کیا ہے۔ دوسرے منتخب ذمہ دار درج ذیل ہیں۔

لائبریرین منہاج الدین خلیلی۔ معتمد رسائل و جرائد انظار الباری رفیقی
معتمد برائے اردو خطابت محمد نعیم شارق۔ معتمد برائے عربی خطابت تمیس احمد فلک
" " انگریزی " عادل عمر کاشانی۔ " " کھیل اور ورزش فیض اللہ خاں
" " خدمت خلق خورشید عالم۔ " صفائی و باغبانی نہال احمد
" انگریزی خطابت برائے عربی اول تا عربی چہارم تشبیر احمد ملک۔ معتمد عربی خطابت عربی اول تا عربی چہارم شمشاد عالم۔ غیر مقیم طلبہ کے نمائندہ کے طور پر محمد آصف، کلیم احمد اور محمد شاہد کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

ان معتمدین کے علاوہ ہر درجہ کے الگ معتمد ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ عربی ہفتم سے محمد طارق، عربی ششم سے محمد آصف، عربی پنجم الف سے عبداللہ صالح، عربی پنجم ب سے عبدالرحمٰن، عربی چہارم الف سے احتشام الدین، عربی چہارم ب سے

رضوان عالم، عربی سوم الف سے عبدالرحمٰن فیضی، عربی سوم ب سے فضیل اقدس عربی دوم الف سے اشتہد ریاض، عربی دوم ب سے ابوبکر، عربی دوم ج سے خلیل اللہ عربی اول الف سے صلاح الدین بستوی، عربی اول ب سے عبدالباری اور عربی اول ج سے حبیب احمد کاظمی منتخب ہوئے ہیں۔

جمعیت کے مقابلے

جمعیۃ الطلبہ ہر سال طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامی مقابلے کراتی ہے۔ اس سال بھی جمعیت کے مقابلے ہو رہے ہیں لیکن ذرا تاخیر سے۔ یہ مقابلے اردو، عربی، ہندی، انگریزی میں تقریر کے علاوہ قرأت، بیت بازی، ورزش اور کھیل کے ہوتے ہیں۔

انتظامیہ کا اجلاس

۱۸، ۱۹، ۲۰ مئی کو جامعہ کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس ہوا۔ شرکاء اجلاس کا زیادہ تر وقت نئے دستور جامعہ پر غور و خوض میں صرف ہوا۔

ابوسفیان اصلاحی صاحب رخصت پر

سیاسیات کے استاد جناب ابوسفیان اصلاحی جامعہ ملیہ دہلی سے سیاسیات میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، ریسرچ کے کام کا تقاضا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے یکسو ہو جائیں۔ اسی کے پیش نظر وہ ایک سال کے لئے رخصت پر چلے گئے ہیں، ہمیں دوبارہ ان کی واپسی کا انتظار رہے۔

سہ ضلعی اجتماع

۱۶ اور ۱۷ مئی ۱۹۹۶ء کو جامعہ میں جماعت اسلامی ہند اضلاع اعظم گڑھ، دیوریا اور گورکھپور کا سہ ضلعی اجتماع ہوا۔ اس موقع سے درس قرآن و حدیث اور مختلف موضوعات پر تقریروں اور کارکردگی کے جائزہ کے علاوہ ایک اہم مذاکرہ اور خطاب عام بھی ہوا۔

مولانا سید جلال الدین عمری ناظم جامعہ و نائب امیر جماعت اسلامی ہند برائے تربیت، مولانا محمد یزدانی صاحب سکریٹری جماعت، مولانا نظام الدین

صاحب اصلاحی رکن شوریٰ، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صدر جامعہ، جناب نصرت علی صاحب امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی اور جناب مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی ناظم علاقہ گورکھپور جیسے معززین سے شرکائے اجتماع کو استفادہ کا موقع ملا۔

توسیعی لکچر

طلبہ کے اندر مطالعہ کی وسعت پیدا کرنے کیلئے جامعہ کی طرف سے مختلف موضوعات پر لکچر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس سال اس سلسلہ کا آغاز مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی سکریٹری جماعت اسلامی ہند برائے دعوت اور ممبر انتظامیہ جامعۃ الفلاح کے لکچر سے ہوا۔ موصوف یہاں سے قریب تاجپور، اترولیہ کے رہنے والے ہیں۔ شبلی کالج سے بی اے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالمیت کے بعد رامپور کی ایک درسگاہ جامعۃ المعارف میں شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق درس مولانا عبدالوہاب صاحب سے صحاح کا دورہ کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ صدر جامعہ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور تنہا اس دورہ میں ہم سبق رہے ہیں۔ اس کے بعد مختلف یونیورسٹیوں سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں انہوں نے حاصل کیں۔ "کانتی" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ ہندی زبان میں تقریباً دو درجن کتابوں کے مترجم ہیں۔ اس کے پہلے جماعت اسلامی ہند ہریانہ اور دہلی کے ذمہ دار بھی رہے ہیں۔

۱۵ر۵ر۱۹۹۶ء کو موصوف کا پہلا لکچر بعنوان "بھگتی کال کے ہندی ادب کا تعارف" ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ ہندی شعراء میں دو نظریات کے حاملین ہمیشہ پائے جاتے رہے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو غیر تجسیمی خدا کو مانتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو تجسیمی خدا کے قائل ہیں۔ بھگتی کال میں بھی یہ دونوں گروہ پائے جاتے ہیں۔ غیر تجسیمی خدا کے قائل شعراء کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ ہیں جنہوں نے جامد عبادت کے خلاف آواز اٹھائی۔ بے روح دھرم کو ڈھونگ بتایا اور گیان دھیان کی باتیں

کیں۔ اس گروہ کو گیان مارگی کہا جاتا ہے۔ اس کے سرخیل کبیر داس ہیں۔ غیر تجسیمی خدا کا قائل دوسرا گروہ تھا جس نے انسانیت کی بات کی، اخلاقی قدروں کی بات کی، خدا کی ذات اور اس کی صفات کی بات کی اور ایسے پریم کا پیغام دیا جو سکھ شانتی کا موجب ہو اور دنیا و آخرت دونوں میں فلاح و کامرانی سے ہمکنار کرے۔ یہ گروہ پریم مارگی کہلایا۔ اس گروہ میں بالعموم وہ صوفی شعراء شامل ہیں جنہوں نے ہندی کے واسطہ سے اسلام (تصوف) کا پیغام عام کرنے کی کوشش کی۔ اس کے سرخیل ملک محمد جائسی ہیں۔ قطبنؔ اور منجھن شاہ بھی اس میں شریک ہیں۔ صوفی شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے جو اس گروہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ ملا داؤد جو ہندی ادب کے دور اول کے شاعر ہیں، انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد تصوف ہی کو قرار دیا ہے یہ ہندی کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کی مشہور کتاب چنداین اپنے زمانہ کی مقبول عام کتاب تھی۔

بھگتی کال میں تجسیمی خدا کے قائل شعراء کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ہندوؤں کی مذہبی شخصیت یعنی راجہ دشرتھ کے بیٹے رام چندر سے عقیدت رکھتا ہے۔ اسے رام مارگی کہتے ہیں۔ تلسی داس اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ انکی مشہور کتاب رام چرت مانس ہے جو ہندوؤں میں بڑے احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں رام چندر جی کو مریادا پرشوتم قرار دیا ہے اور عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

تجسیمی خدا کے قائلین کا دوسرا گروہ کرشن مارگی ہے جو کرشن جی سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے سرخیل سور داس ہیں، جنہوں نے برج بھاشا میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے اور کرشن کی مختلف لیلاؤں کو بڑے نفسیاتی انداز میں واضح اور نمایاں کیا ہے۔ رس خان کو بھی کرشن مارگیوں کی صف میں آتے ہیں۔

بھگتی کال کے تجسیمی خدا کے قائلین کے پیش نظر جہاں ہندو روایات

تہذیب، مسلمات اور رسم و رواج کو زندہ کر کے ہندو احیاء پرستی کی تحریک چلاتا تھا وہیں گیان مارگیوں نے جامد مذہبیت اور بے روح معاشرتی رسم و رواج پر سخت تنقیدیں کیں۔ کہیں کہیں انکی تنقیدیں اپنی حدود سے تجاوز بھی کر گئی ہیں، بالخصوص اسلام کے سلسلہ میں انکی تنقیدیں لاعلمی اور کم علمی کا مظاہرہ کرتی ہیں، البتہ بھگتی کال کے صوفی شعراء نے اسلامی حدود کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اور اپنی شاعری میں معیاری اور فصیح و بلیغ زبان استعمال کرتے ہوئے امن و محبت کا پیغام پیش کیا ہے جو مختلف پہلوؤں سے قابل تحسین ہے۔

دوسرے دن ۱۶؍۵؍۱۹۹۴ء کو مولانا کوثر یزدانی نے ایک اور لکچر بعنوان "ہندو دھرم، اسکے انحرافات اور اصلاحی کوششیں" دیا جس میں تفصیل سے موصوف نے خدا، آخرت اور ہدایت الٰہی کے باب میں ہندوازم کے تصور کا جائزہ لینے کے علاوہ چاروں ویدوں پر بھی گفتگو کی جن میں کسی نہ کسی انداز میں توحید، رسالت اور آخرت کی بات ملتی ہے۔ اس ضمن میں بدھ ازم، جین ازم وغیرہ نیز آریہ سماج سناتن دھرم اور راشٹریہ سویم سنگھ بھی زیر بحث آئے۔

مولانا عبید اللہ خاں اعظمی جامعہ میں

جنرل سکریٹری جنتا دل اور ممبر راجیہ سبھا جناب مولانا عبید اللہ خاں اعظمی صاحب ۱۳؍۵؍۱۹۹۴ء کو جامعہ تشریف لائے۔ موصوف کے ہمراہ ان کے ماموں سابق آر سی کمشنر مولانا عبد الجبار خاں صاحب بھی تھے۔ دونوں نے طلبہ سے خطاب کیا، مسلکی اور گروہی تعصبات سے بلند ہو کر اتحاد و اتفاق کے ساتھ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور کلمہ کفر کو سرنگوں کرنے پر زور دینے کے علاوہ جامعۃ الفلاح کو زبردست خراج تحسین پیش کیا انہوں نے کہا کہ جامعہ کے بانیوں اور علم کے قدردانوں نے جامعہ کی شکل میں اپنی برتری کا لوہا منوالیا ہے۔ یہ جامعہ علم و فضل کا ایسا سمندر ہے جس کے صاف شفاف چشمہ سے پورے ملک کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ صرف اس علاقہ

کے لئے فلاح ثابت نہیں ہو رہا ہے بلکہ نیشنل اور انٹرنیشنل طور پر فلاح وصلاح کی ذمہ داریاں ادا کر رہا ہے۔

جامعہ اشرفیہ مبارکپور سے فارغ مولانا عبید اللہ اعظمی بلریا گنج سے پورب ۸ کلومیٹر کے فاصلہ پر خالص پور کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد جناب حافظ غلام رسول صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں استاد رہ چکے ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم سابق استاذ جامعہ سے انہیں گہرا تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول مولانا عبید اللہ اعظمی مولانا جلیل احسن ندوی نے ہی ان کا نام رکھا۔ مولانا کے ساتھ آئے ہوئے ان کے ماموں کی تعلیم مظہر العلوم بنارس میں بھی ہوتی ہے جہاں مولانا عبد العلیم صاحب اصلاحی کے سامنے انہوں نے تین سال تک زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

صدر جامعہ نے معزز مہمانوں کے علم میں یہ بات لائی کہ جامعہ کی خشت اول ہی یہ ہے کہ یہاں ایسے طلبہ تیار کئے جائیں گے جو قرآن وحدیث پر محققانہ نگاہ اور ضروری عصری علوم سے آگاہی کے ساتھ گروہی اور مسلکی تعصب سے بلند ہو کر اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کا اپنے اندر حوصلہ رکھیں گے۔

ایک سابق استاد جامعہ کا انتقال

انگریزی کے ایک سابق استاد جامعہ جناب ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب جو تلے گاؤں دھامسر، امراوتی مہاراشٹر کے رہنے والے تھے اور عرصہ ہوا یہاں سے ریٹائرڈ ہو کر جا چکے تھے، مصدقہ اطلاع کے مطابق گذشتہ ماہ ان کے گاؤں میں انکے گھر میں، رات کے وقت، انہیں اور انکی اہلیہ کو نامعلوم شرپسندوں نے قتل کر ڈالا۔ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔ مرحوم جناب ڈاکٹر قاسم رسول الیاس ایڈیٹر افکار ملی کے خالو ہوتے تھے۔ اس واقعہ کی ہم مذمت کرتے اور ان کے لئے دعاء مغفرت کے ساتھ پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی توفیق طلب کرتے ہیں۔

عبد العظیم کولوی کو صدمہ

تاخیر سے ملی اطلاع کے مطابق مہاراشٹر کے

بقیہ: ص ۳۶ پر

حلقہ یاراں

عزیز گرامی قدر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی حفظہ اللہ / مدیر ماہنامہ حیات نو،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: الحمدللہ خیریت حاصل و مطلوب

رمضان مبارک سے قبل بنگلور میں انگریزی اخبار میں ٹائم (NEW EN TIME) کا جو افتتاحی اجلاس ہوا تھا اس موقع پر آپ سے پہلی مرتبہ تفصیلی ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ورنہ اس سے قبل جب بھی آپ سے ملاقات ہوئی سرسری اور رواروی کا انداز ہوتا تھا۔ میری خواہش ہے کہ آپ کسی وقت بنگلور تشریف لائیں تو عمرآباد بھی چلے آئیں۔ یہاں جامعہ کی جو سرگرمیاں ہیں انہیں آپ دیکھیں گے تو آپ کو بڑی مسرت ہوگی

مجھے یہ معلوم کر کے بے انتہا مسرت ہوئی کہ عزیز گرامی قدر، فاضل اجل مولانا جلال الدین صاحب عمری اس وقت "جامعۃ الفلاح" کے سربراہ (ناظم) منتخب کئے گئے ہیں یہ نہ صرف ان کیلئے بلکہ میرے لئے اور ہمارے جامعہ کے اساتذہ کیلئے بھی بہت بڑا اعزاز ہے مولانا موصوف کی گوناگوں مصروفیات اور ذمہ داریاں ہیں ان میں ایک نئی اور اہم ذمہ داری کا اضافہ ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس نازک ذمہ داری کو بخیر و خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی توفیق و ہمت عطا فرمائے۔ علی گڑھ ہی میں رہ کر عزیز موصوف اپنے تجربات کی روشنی میں ارباب جامعہ کو مفید مشورے دیتے رہیں گے۔ لیکن کبھی کبھی جامعۃ الفلاح پہنچ کر وہاں کے کاموں کا جائزہ لینا بھی ان کیلئے ضروری ہے، میں سمجھتا ہوں کہ خود ان کو بھی اس کا احساس ہوگا اور یہ خدمت بھی وہ انجام دیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ماہنامہ حیات نو کے کسی شمارہ میں مولانا جلال الدین صاحب عمری

کا انٹرویو شائع ہوا تھا وہ پرچہ یا تو عمرآباد نہیں آیا ہے یا مجھے دستیاب نہیں ہو سکا ہے
براہ کرم اس شمارہ کی پانچ کاپیاں میرے نام روانہ کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں
امید ہے کہ ماہنامہ "راہ اعتدال" دفتر "حیات نو" کو برابر پہنچ رہا ہوگا۔ میں اس
وقت آپ کو اپنے ایک ذاتی حادثے کی اطلاع بڑے افسوس کے ساتھ دے رہا
ہوں وہ یہ کہ میرے ایک چھوٹے بھائی مولوی محمد ثناء اللہ خاں عمری ۶ رمئی کو بنگلور کے
ہسپتال میں ایک طویل علالت کے بعد وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
وہ میرے بھائی ہونے کے علاوہ میرے شاگرد رشید، میرے ایک بچے کے ہمزلف
نیز ایک اور بچے کے خسر بھی تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ عزیز القدر مولانا سید
جلال الدین صاحب عمری کے وہ ہم جماعت تھے انہیں کے ساتھ ہمارے جامعہ میں ان
کا داخلہ ہوا اور انہیں کے ساتھ فراغت بھی ہوئی۔ پھر ان دونوں کو میں بنگلور لیکر گیا
اور وہاں کچھ عرصہ دونوں ساتھی میری نگرانی میں ہفتہ وار "پیغام" نکالتے رہے۔ تقریبا
دس سال میرے بھائی اور مولانا جلال الدین صاحب عمری دونوں ساتھ عمل کرتے رہے ہیں۔
اگست ۱۹۹۵ء کے حیات نو میں حافظ ناصر الاکرم کے حادثہ وفات کی خبر پڑھکر اور بچے
کی نظم دیکھکر میں بہت متاثر ہوا تھا اب وہ حادثہ بھی میرے دل میں تازہ ہوگیا۔ دعاؤں
میں یاد رکھیں۔

گھر میں سب کو سلام مسنون عرض ہے۔

والسلام

آپکا دعاگو۔ ابوالبیان حماد

تأثراتِ غم

ابوالبیان حمّاد

اللہ کا تھا فیصلہ جو کام کر گیا / بیمار درد و کرب جہاں سے گذر گیا
ہر دل عزیز بھائی ہمارا کدھر گیا / آیا تھا وہ جہاں میں جدھر سے اُدھر گیا
پہلے ہی میرے سینے میں کچھ کم نہیں تھے غم / اک اور تازہ زخم اچانک اُبھر گیا
اہل و عیال بھائی بہن سب کو چھوڑ کر / حسنِ عمل کا لے کے وہ زادِ سفر گیا
دیکھا جو خاندان کے غم و درد کا سماں / بے ساختہ قضا کا بھی چہرہ اتر گیا
تھی اس کی زندگی بھی عجب مختصر سی / شعلے کی طرح چمکا مثالِ شرر گیا
ٹھہرا رہا جہاں میں مسافر کی طرح وہ / اللہ نے بلایا تو پھر اپنے گھر گیا
موت آگئی اسے کہ نئی زندگی ملی / مرنے کے بعد اور بھی چہرہ نکھر گیا
آنکھیں ہوئیں جو بند تو نیند آگئی اسے / نیند آگئی تو لب پہ تبسم بکھر گیا
کتنی دوائیں، کتنی دعائیں ہوئیں مگر / وقت آگیا تو نالۂ غم بے اثر گیا
وہ تو چلا گیا ہے خدا کے حضور میں / پر ہم سبھوں کو دے کے غمِ معتبر گیا
وہ دوسروں کے غم کو سمجھتا تھا اپنا غم / ہمدرد و حق شناس و حقیقت نگر گیا
آواز دی خدا نے تو لبیک کہہ دیا / پیمانۂ زندگی کا بہت جلد بھر گیا

حمّاد اپنے رب کی ملاقات کے لئے
بھائی ثناؔ تو موت کے پل سے گذر گیا